سلسلۂ مطبوعات : مشاہیرِ اُردو

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

زینت افشاں

مقتدرہ قومی زبان پاکستان

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

زینت افشاں

مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

۲۰۱۱ء

انتساب

پیارے ابا جان

میاں عبدالقادر

کے نام

جن کی شفقت آج بھی مجھ پر ویسے
ہی سایہ فگن رہتی ہے جیسے اُن کی
زندگی میں چھاؤں کیے رکھتی تھی مگر جو
دکھ ہے، سو ہے۔
اماں جان کے نام بھی جو میرے لیے
مجسم رحمت ہی رحمت ہیں۔

پیش لفظ

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیادگزاروں کو یادرکھا جانا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کواُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیادگزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔ اس منصوبے کے تحت مختلف شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے وقیع کتابیں مرحلہ وار شائع ہوتی رہیں گی۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اردو کے عہد ساز استاد، محقق، تنقید نگار اور مدیر ہیں۔ ان کی شناخت کی متعدد جہتیں ہیں مگر سب جہتوں میں مشترک پہلو اُردو ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی درجنوں تحقیقی اور تنقیدی کتابیں اردو ادب کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہیں۔ آپ ایک طویل مدت اردو زبان وادب کی درس وتدریس کا کام کرتے رہے اور سیکڑوں شاگرد اردو کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے ڈاکٹر صاحب کی انھی خدمات کے اعتراف کے طور پر اُن کی شخصیت اور فن کے بارے میں کتاب لکھوانے کا فیصلہ کیا۔

زینت افشاں اردو ادب کی باصلاحیت سکالر ہیں۔ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے سلسلۂ مطبوعات مشاہیرِ اُردو کے لیے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے احوال وآثار کو محیط یہ مختصر مگر جامع کتاب لکھ کر اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ امید ہے قارئین اس کتاب کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن کو صحیح تناظر میں سمجھ سکیں گے۔

——— ڈاکٹر انوار احمد

دیباچہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایک استاد، محقق، تنقید نگار اور مدیر کی حیثیت سے اُردو دنیا میں بے حد ممتاز مقام و مرتبے کی حامل شخصیت ہیں۔ مختلف و قیع اور اہم موضوعات پر درجنوں کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مرتب ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں شاگرد نہ صرف یہ کہ اُن کے عقیدت مند ہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقامات پر فائز ہیں۔ ان میں سے متعدد شاگرد علمی اعتبار سے اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا علمی کام اتنی زیادہ جہتوں کو محیط ہے کہ پیش نظر کتاب میں اُن کا اطمینان سے ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا چہ جائے کہ تفصیل سے روشنی ڈالی جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب کی اُردو کے لیے خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے ساری زندگی گلشن اردو کی آبیاری میں صرف کی۔ درس و تدریس کے سلسلے میں بھی اُردو کے لیے تبلیغ کو اپنا منصبی فریضہ سمجھ کر غیر معمولی خدمات سرانجام دیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نہ صرف یہ کہ اپنے عہد میں درس و تدریس، تحقیق و تنقید اور اردو انشا پردازی کے بے بدل عالم تھے بل کہ آنے والے وقتوں میں اردو ادب کی تاریخ ان کی خدمات کے تذکرے کے بغیر کسی صورت میں مکمل نہیں ہوگی۔ انھوں نے اردو کے دامن میں ایسی عظیم کتابیں ڈالی ہیں کہ جن کا کوئی متبادل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب جہاں علمی حوالوں سے غیر معمولی حیثیت کی حامل شخصیت ہیں وہاں روحانی طور پر بھی ہزاروں مریدوں کے لیے برس ہا برس تقویت کا سبب رہے۔ امید ہے میری یہ ادنیٰ سی کاوش قارئین میں شرفِ قبولیت حاصل کر لے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے طرز زندگی کے حوالوں سے ہمارے عظیم اسلاف کا بہترین نمونہ تھے۔

اس کتاب کے حوالے سے یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ مشاہیر اردو منصوبے کے نگران ڈاکٹر راشد حمید نے مجھ سے ہر ممکن تعاون کیا، میں ان کی بے حد سپاس گزار ہوں۔

——— **زینت افشاں**

فہرست

عنوانات	صفحہ نمبر

باب اول

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا سوانحی خاکہ

(الف) تاریخ وسال پیدائش

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں جبل پور (سی ۔ پی) بھارت میں پیدا ہوئے ۔ ان کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ ان کی اصل تاریخ پیدائش ۱۰ شوال المکرّم ۱۳۳۰ھ/ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء ہے۔ مسرور احمد زئی کے مطابق:

> ''میٹرک کی سند پر یکم جولائی ۱۹۱۲ء ہے، جو اصل سے تقریباً ڈھائی ماہ زیادہ ہے۔''(۱)

ان کے والد محترم گلاب خاں اور والدہ محترمہ محفوظ النسا بیگم تھیں۔ ابتدا میں ڈاکٹر صاحب کا نام ''محمد مصطفیٰ خاں'' رکھا گیا لیکن بعد میں ان کی والدہ محترمہ (محفوظ النسا بیگم) نے یہ نام بدل کر ''غلام مصطفیٰ خاں'' رکھ دیا۔ تین برس کی عمر میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے چچا تراب خاں نے پیار سے انھیں ''ملاجی'' کہنا شروع کر دیا۔ پھر محلے کے بچے بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔

(ب) خاندانی پس منظر

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا تعلق یوسف زئی پٹھان خاندان سے تھا۔ ان کے ننھیال کے آباء واجداد کا تعلق شمال مغربی ہندوستان سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے جدامجد سلطان خاں یوسف زئی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے رام پور پہنچے اور وہاں سے ہندوستان کے قصبہ چھپارا ضلع سیونی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین بیٹوں مولیٰ خاں، کمال خاں اور جمال خاں کے نام معلوم ہیں جب کہ ایک بیٹے کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

یہ چاروں فن سپاہ گری میں ماہر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے پردادا مولیٰ خاں تھے۔ وہ بھی اپنے تینوں بھائیوں کی طرح فن سپاہ گری میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

''ناگ پور کے ہندو راجا اور اس کے شمالی اضلاع والے دشمنوں کے درمیان میرے یہ سب بزرگ اور ان کے دوسرے اعزا ایک آہنی دیوار کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر فریق ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ سیونی میں نئی نئی انگریز عدالت قائم ہوئی ۲ ستمبر ۱۸۲۳ء سے ۲ ستمبر ۱۸۲۵ء تک Captain T, worldow وہاں کا ڈپٹی کمشنر Principal Assistant to the Agent to the Governor General in India مقرر رہا۔ اس کے بعد J.stephen ۶ دسمبر ۱۸۲۵ سے مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں میرے پردادا مولیٰ خاں نے کسی ہندو کو مار ڈالا۔''[۲]

مولیٰ خاں (پردادا) نے ایک ہندو کا قتل اس لیے کر دیا کہ اس نے مسلمانوں کی تذلیل کی تھی۔ مولیٰ خاں (پردادا) کو جے سٹیفن (J-Stephen) کی عدالت میں بلوایا گیا۔ وہ اپنے بھائیوں کی ہمراہی میں عدالت پہنچے۔ جے سٹیفن (J.Stephen) نے عدالت میں توہین آمیز رویہ اختیار کیا، جس پر مشتعل ہو کر ان کے بھائیوں نے عدالت ہی میں جے سٹیفن (J.Stephen) کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۷ اگست ۱۸۲۷ء کا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انگریزوں اور ان کے حامیوں نے چاروں بھائیوں پر دھاوا بول دیا۔ جب فساد بڑھ گیا تو چاروں بھائی بھاگ کر قریبی جنگلات میں چھپ گئے۔ کیوں کہ تب تک وہاں فوج پہنچ چکی تھی۔ اس واقعہ میں مولیٰ خاں (پردادا) کے والد اور چھوٹے بھائی شہید ہو گئے۔ ضلع سیونی میں ان شہیدوں کے مزار موجود ہیں اور اب بھی ان کی یاد میں سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔

مولیٰ خاں (پردادا) بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کا آموں کا بڑا باغ تھا اور پناگر میں کھیتی باڑی بھی کیا کرتے تھے۔ انھوں نے پناگر میں ایک محلّہ پٹھانی کے نام سے آباد کیا۔

ابتدا میں صرف یوسف زئی پٹھان خاندان ہی وہاں مقیم تھا لیکن بعد میں باندہ پٹھان اور شیخ خاندان بھی وہاں آ کر آباد ہو گیا۔ مولیٰ خاں (پردادا) کی اولاد میں دو بیٹے وزیر خاں، حافظ موسیٰ خاں اور ایک بیٹی جنت بی شامل ہیں۔

وزیر خاں (ڈاکٹر صاحب کے دادا) کے تین بیٹے گلاب خاں، اکبر خاں اور تراب خاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد (گلاب خاں) بہت خوب صورت تھے، لمبی ناک، کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں، جب سوتے تو پپوٹوں سے آنکھیں کھلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان کا چہرہ گلاب کی طرح تر و تازہ تھا۔ اس لیے ان کے والد نے ان کا نام گلاب خاں رکھا تھا۔ وہ بہت ذہین اور سلیقہ مند تھے۔

پنا گر کے چھوٹے سے قصبہ میں ہندی کا ایک ہی اسکول تھا۔ گلاب خاں (والد) نے وہاں سے پرائمری کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا اور جبل پور کے ٹیچرز نارمل اسکول میں نمایاں کام یابی حاصل کی۔ اس کے بعد بعض حضرات کے مشورے سے ریلوے پولیس میں حوالدار ہو گئے۔ جلد ہی گلاب خان (والد) نے اس ملازمت سے استعفا دے دیا۔ کیوں کہ ان کی وہاں مخالفت کی جا رہی تھی۔ یہ ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ اسکول میں مدرس ہو گئے۔

گلاب خاں (والد) اردو اور ہندی کے خوش نویس تھے۔ وہ نہایت خوب صورتی اور باریک بینی سے خاکے اور نقشے تیار کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد (گلاب خاں) کی شادی ۲۰ سال کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔

گلاب خاں کی اولاد میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ سب سے بڑی کبیر النسا (بیٹی) پھر حاجی نذیر احمد خاں (بیٹا)، منجھلے بیٹے عبد الرحمان خاں، احدی بیگم (بیٹی) اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ہیں۔ گلاب خاں کا انتقال ۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء کو ہوا اور وہ رانی تالاب کے قبرستان جبل پور میں سپرد خاک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ محفوظ النسا بیگم کا انتقال ۲۳ ستمبر ۱۹۵۶ء کو حیدر آباد (سندھ) میں ہوا اور وہ کراچی میں آسودۂ خاک ہیں۔

(ج) ننھیال

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے پرنانا مولانا عبدالوہاب خاں غرغشتی کے رہنے والے تھے۔ ان کے پرنانا کاکڑ پٹھان تھے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے مطابق:

> ''راول پنڈی سے پشاور کے راستے میں کیمبل پور کے قریب ۵۴ میل غرغشتی مقام ہے۔ وہاں صرف ایک خاندان کاکڑ پٹھان کا ہے۔ ان کے جدامجد اخوند محمد بشارت تھے، ان کے ایک صاحب زادے محمد موسیٰ خاں (۱۸۶۱ کے قریب) تھے، جو مولانا عبدالوہاب کے نام سے مشہور تھے۔''(۳)

یہ خاندان جب ہندوستان منتقل ہوا تو انھوں نے اپنے علاقے کے نام سے ضلع کیمبل پور میں ایک قصبہ بنایا۔ راجستھان کے شہر جے پور سے قریباً ۶۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ۶ جنوری ۱۸۱۸ء کو نواب امیر خاں جنھیں باقاعدہ والیِ ٹونک تسلیم کیا جاتا تھا، ان کے یہاں آئے۔ یہ مولانا عبدالوہاب (پرنانا) کے معتقد تھے۔ مولانا عبدالوہاب (پرنانا) بزرگ تھے اور ان کے پاس ہر وقت لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ وہ لوگوں سے بچنے کے لیے ٹونک سے جادرہ چلے گئے۔

انھوں نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی اولاد میں دو بیٹے تھے۔ ان کی دوسری شادی جادرہ کے سید خاندان میں بیگم جان سے ہوئی۔ ان کے بطن سے دو بیٹے حکیم عبدالکریم خاں، مولانا عبدالقادر خاں اور بیٹی زینب پیدا ہوئیں۔ مولانا عبدالقادر خاں (نانا) ۱۸۵۷ کے قریب جادرہ (گلشن آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی چاند بی بی سے ہوئی۔ وہ حکمت بھی کیا کرتے تھے۔ اس لیے لوگ علاج کے لیے ان کے پاس آیا کرتے۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ مولانا عبدالقادر خاں کی اولاد میں سب سے بڑی بیٹی حفیظ النسا ڈاکٹر صاحب کی والدہ تھیں۔

(د) ازدواجی زندگی اور اولاد

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی ان کی ماموں زاد (کنیز آمنہ) سے ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ وہ حافظہ تھیں۔ ان سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

۷فروری ۱۹۳۸ءکو ان کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا انتقال ۸ فروری ۱۹۳۸ءکو ہو گیا۔ ۱۱اکتوبر ۱۹۳۹ء کو بیٹی کنیز فاطمہ (ہاجرہ) کی پیدائش ہوئی۔ ان کی شادی مقامی کالج کے پرنسپل پروفیسر ایاز الدین سے ہوئی۔ ۱۵۔ اپریل ۱۹۴۱ءکو ظفر احمد خاں (بیٹا) کی ولادت ہوئی۔ انھوں نے سندھ یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات سے مکتوبات امام ربانی کی دینی اور معاشرتی اہمیت کے موضوع پر ۱۹۴۷ میں پی ایچ ڈی کی۔ ۱۲ جولائی ۱۹۴۳ءکو ان کے یہاں تیسرے بیٹے ظفر احمد خاں کی پیدائش ہوئی وہ مجذوب الحال ہیں۔ ۷ جون ۱۹۴۶ءکو ان کی بیٹی صابرہ پیدا ہوئیں جن کا انتقال ۱۱ فروری ۱۹۴۷ءکو ہو گیا۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۷ءکو ان کا چوتھا بیٹا عزیز احمد پیدا ہوا۔ ان کی ولادت ناگ پور میں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب ۷ نومبر کو پہلی مرتبہ پاکستان (کراچی) آئے۔ ان کی بیوی اور بچہ بھی ساتھ تھا۔ یہاں ۲۴ نومبر کو ان کے بیٹے عزیز احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے صرف چار دن بعد ہی ۲۸ نومبر ۱۹۴۷ءکو ان کی اہلیہ (کنیز آمنہ) بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں اور وہ کراچی ہی میں مدفون ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دوسری شادی وکیل عبدالحمید خاں کی بڑی صاحبزادی قمر بیگم سے ۳۰ اگست ۱۹۴۹ءکو ہوئی۔ ان سے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ءکو ان کے یہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی، جس کا انتقال ولادت کے چند لمحوں بعد ہی ہو گیا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۶۴ءکو ان کی بیٹی سعدیہ کی ولادت ہوئی۔ انھوں نے بی ایس سی کی اور عربی امتحان میں پورے پاکستان میں سکینڈ پوزیشن حاصل کی۔ ان کے شوہر سہیل رفعت خاں سپارکو میں آفیسر ہیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی صفیہ ہیں۔ انھوں نے بی اے اور ایم اے سندھ یونی ورسٹی سے کیا اور اول پوزیشن حاصل کی۔ صفیہ (بیٹی) نے ہمدرد یونی ورسٹی کراچی سے ۱۹۹۸ء میں ''اردو شاعری میں قرآنی تلمیحات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے شوہر ڈاکٹر آفتاب احمد خاں ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خاں نے سندھ یونی ورسٹی سے ۱۹۸۸ء میں ''خاندان نقشبندیہ کی علمی خدمات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

۷ فروری ۱۹۹۱ءکو ان کی دوسری اہلیہ محترمہ قمر بیگم کا انتقال ہوا۔ وہ لطیف آباد نمبر ۹ حیدر آباد میں سپرد خاک ہیں۔

(۵) تعلیم

ڈاکٹر صاحب کی دینی تعلیم گھر پر ہوئی۔ان کی تربیت میں گھر کے مذہبی ماحول کا بہت عمل دخل ہے۔انھوں نے قرآن پاک گھر پر ہی پڑھا۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں لکھتے ہیں:

''بڑے بھائی نے پہلے پارے کے چند رکوع بہت سمجھا کر پڑھا دیے اس کے بعد میں خود پڑھنے لگا اور پورا قرآن خود ختم کرلیا۔جب قرآن پاک ختم کرلیا تو والد صاحب نے کہا بیٹا میرا قرآن سن لو کہیں غلطی ہو تو صحیح کردو۔''(۴)

اس کے بعد انھوں نے اپنے والد اور والدہ کا قرآن پاک سنا۔۱۹۱۷ء میں انھیں چھپا محلّہ کٹنی کے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔بعد ازاں انھیں دلہائی محلّہ جبل پور میں داخلہ دلوادیا گیا۔ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۳ء میں کھٹک محلّہ کے ایک اسکول سے پرائمری کیا۔جب وہ پرائمری میں تھے تو پورے شہر میں اول پوزیشن حاصل کی ،انھیں چار سال تک ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ڈاکٹر صاحب کے والد (گلاب خاں) یہ روپے جمع کرتے رہے اور ان روپوں سے اپنے مکان سے ملحقہ مکان ۶۰ روپے میں خرید لیا۔ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''جبل پور کے اسکول میں سخت محنت کرائی جاتی تھی،کوئی مضمون ایسا نہیں تھا، جس میں کمزوری ہو۔آٹھویں جماعت تک وہاں کے طلبہ انگریزی گرامر میں بہت پختگی حاصل کرلیتے تھے۔یعنی Analysis بہت آسانی سے کرلیتے تھے اور شہر کے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں بہت ممتاز تھے۔''(۵)

۱۹۲۸ء میں انھوں نے انجمن ہائی اسکول (جبل پور) سے نویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔انھوں نے وہاں آٹھ سال قیام کیا۔اس آٹھ سالہ قیام کے دوران ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ کالج سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔۱۹۳۱ء میں علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کیا۔لازمی مضامین کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے انٹرمیڈیٹ کے اختیاری مضامین فارسی،تاریخ اور جغرافیہ تھے۔انھیں یہاں بہترین اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ان اساتذہ میں ضیا

احمد بدایونی ، ابرار احمد قادری، احسن مارہروی اور اشفاق صاحب (نواب وقار الملک کے صاحبزادے) شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر مسرور احمد زئی:

''اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو مذہبی موضوعات پر بحث و مباحثہ کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ اس سے متعلق مسائل آپ احسن مرحوم سے معلوم کیا کرتے تھے۔''(۶)

۱۹۳۲ء میں تجوید، قرأت اور عربی کا امتحان پاس کیا۔ قرأت میں ڈاکٹر صاحب کے اساتذہ ضیاء الدین احمد الہ آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مکی ثم الہ آبادی، عبداللہ صاحب مکی اور ابراہیم سعد مصری ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ اس لیے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے کے ساتھ شام کی کلاسز میں علی گڑھ میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔

۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی ۱۹۳۶ء میں ان کی ایل ایل بی بھی مکمل ہو گئی۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے ایم اے اردو بھی کر لیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے ۴ اپریل ۱۹۴۷ء میں مشہور شاعر سید حسن غزنوی پر مقالہ تحریر کر کے سندھ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں ''فارسی پر اردو کا اثر'' مطبوعہ ۱۹۵۲ء، ''حالی کا ذہنی ارتقا'' مطبوعہ ۱۹۵۶ء اور علمی نقوش کے موضوع پر مقالات تحریر کر کے ناگ پور یونی ورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب دوران تعلیم بہت سے صاحب کمال اساتذہ سے فیض یاب ہوئے۔ جس کا ذکر اکثر و بیشتر اپنی نجی محافل میں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی یادوں کے حوالے سے دو طویل مضامین ''میرا علی گڑھ'' اور ''میرا جبل پور'' کے عنوان سے لکھے اور ان میں نہایت احترام کے ساتھ اپنے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان میں ضیاء الدین الہ آبادی، ضیا احمد بدایونی، مولانا سلیمان اشرف، مولانا احسن مارہروی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا ابوبکر، محمد شیث جونپوری، ڈاکٹر ہادی حسن، نواب صدر یار جنگ اور مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب خاص طور پر قاری ضیاء الدین احمد کا ذکر محبت سے کیا کرتے کیوں کہ

انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے ستر سال کی عمر میں ایک ہزار میل کا سفر طے کیا اور امراؤتی آئے۔انھوں نے یہاں آکر ڈاکٹر صاحب کو تجویداورقرأت سکھائی۔اس کے علاوہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری اور مولانا سید سلیمان اشرف کا اکثر وبیشتر ذکر کیا کرتے۔ان اساتذہ سے انھوں نے عربی اور تفسیر پڑھی۔

(و) ہجرت اور ملازمت

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام میں آنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی نذیر احمد خاں نے پاکستان ہجرت کی۔وہ اپنے ساتھ اپنی اہلیہ اور والدہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو بھی لے آئے۔ڈاکٹر صاحب ۵نومبر ۱۹۴۷ء کو اپنی اہلیہ (کنیز آمنہ) اور بیٹے (عزیز احمد) کے ساتھ ممبئی سے روانہ ہوئے۔وہ ۳۶ گھنٹے بحری جہاز کا سفر کرنے کے بعد ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان (چاکی واڑا) پہنچے۔یہیں ان کے بیٹے اور اہلیہ کا انتقال ہوا،جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔اس کے بعد دسمبر ۱۹۴۷ء میں واپس ناگ پور (ہندوستان) چلے گئے لیکن ابھی واپس گئے ہی تھے کہ ان کے بڑے بیٹے (سراج احمد خاں) شدید بیمار ہوگئے۔ان کی بیماری کی خبر سن کر انھوں نے مستقل پاکستان آنے کا فیصلہ کرلیا۔ڈاکٹر راشد حمید کے روزنامہ نوائے وقت اسلام آباد کے ادبی ایڈیشن میں ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے موقع پر شائع ہونے والے مضمون میں درج ہے کہ آپ مستقلاً ۲۲۔جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان تشریف لے آئے۔

کراچی میں انھوں نے مکان نمبر ۳۲۸،پیر الٰہی بخش کالونی میں سکونت اختیار کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو قیام پاکستان سے پہلے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور ۱۵ جولائی ۱۹۳۷ء کو کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ انھوں نے دورانِ ملازمت ۲۹۔اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ہندی کا امتحان دیا اور صوبہ بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ان کے قیام پاکستان سے پہلے ملازمت کا دورانیہ گیارہ سال پر محیط ہے۔ان کی پہلی تقرری امراؤتی میں کنگ ایڈورڈ کالج میں ہوئی بعدازاں ناگ پور یونی ورسٹی میں صدر شعبہ مقرر ہوئے۔اس کے علاوہ یونی ورسٹی کورٹ اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے ممبر رہے۔

جب ہجرت کر کے پاکستان آئے تو اسلامیہ کالج میں اردو کے استاد مقرر ہو گئے۔ یہاں ان کی ملازمت کا دورانیہ دو سال ہے۔ اسلامیہ کالج میں ملازمت کے دوران انھیں پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے سنگاپور جانے کی پیش کش ہوئی لیکن انھوں نے رد کر دی۔ کالج کے ایک تنازعے میں ان کی نوکری چلی گئی۔ بقول مسرور احمد زئی:

> ''کالج میں ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اور کالج کے سیکرٹری کے درمیان اختلافات ہوئے، اسی دوران ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے اسٹرائیک (Strike) کرائی۔ مختلف خطوط اور درخواستوں پر دستخط کرائے۔ ان میں ایک پرچہ استعفا کا بھی تھا، جس کا علم ڈاکٹر صاحب کو بعد میں ہوا۔ اس طرح یہ نوکری جاتی رہی۔''(۷)

نوکری ختم ہو جانے کے بعد تھوڑا ہی عرصہ گزرا کہ مولوی عبدالحق نے ۱۹۵۰ء میں اردو کالج کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تقرری بحیثیت صدر شعبہ یہاں ہو گئی۔ وہ قریباً چھ برس تک اردو کالج سے وابستہ رہے۔ یہاں اپنی منشا سے اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور تاریخ کے مضامین پڑھاتے رہے۔ کراچی یونی ورسٹی میں تدریس کا آغاز ہوا تو انھوں نے وہاں ایم اے کی کلاسیں لینا شروع کر دیں لیکن جب صدر شعبہ اردو کی تقرری کا وقت آیا تو انھیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔

انھوں نے ۱۴ جولائی ۱۹۵۶ء کو علامہ آئی آئی قاضی کی ایما پر سندھ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ کے فرائض سنبھالے۔ علامہ آئی آئی قاضی کے مطابق:

> ''جب جامعہ سندھ میں شعبہ اردو کے لیے صدر شعبہ کی تلاش ہوئی تو ہماری نگاہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں پر ٹھہری۔ آپ کو ہندوستان سے ہجرت کیے ہوئے چند سال ہوئے تھے............انہی دنوں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا آپ سندھ یونی ورسٹی آ جائیں۔ یونی ورسٹی نئی نئی بنی ہے، جو بنیادیں اس وقت رکھ دی جائیں گی۔ وہ مستقبل کے لیے کارآمد اور سود مند ہوں گی۔''(۸)

ڈاکٹر صاحب نے یہاں ۲۰ برس تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور بہت سے طالب علم ان سے فیض یاب ہوئے۔ انھوں نے طلبہ کے لیے رسالہ ''صریر'' کا آغاز کیا، جس

کے کچھ نمبر خاص طور پر بہت مشہور ہوئے۔ ان میں نعت نمبر، قصیدہ نمبر اور غالب نمبر خاص شہرت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں کئی طالب علموں نے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے تحریر کیے۔ ۱۹۷۲ء میں ان کی عمر ساٹھ برس ہوئی تو ان کی ملازمت کی مدت ختم ہوگئی۔ لیکن ان کی ملازمت کی مدت میں مزید چار سال کی توسیع دے دی گئی۔ ۱۹۷۶ء میں وہ سندھ یونی ورسٹی کی ملازمت سے مکمل طور پر سبک دوش ہوگئے لیکن ۱۹۸۸ء میں سندھ یونی ورسٹی نے ان کی بے پناہ علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ''پروفیسر ایمریطس'' کا درجہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب تحقیق میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر جمیل جالبی، جسٹس نعیم الدین، نظیر کامرانی اور ڈاکٹر اسلم فرخی جیسے اہل علم اور دانش ور شامل ہیں۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں ان کے شاگردوں نے زندگی گزارنے کا بہترین لائحہ عمل سیکھا بھی اور اس پر عمل بھی کیا۔

(ز) ماحول، شخصیت اور دیگر مصروفیات

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں خوب صورت اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ صحت مند اور ورزشی جسم تھا۔ ان کی معجزیاتی شخصیت ملنے والے کے دل میں گھر کر لیتی اور اس کا اثر ساری زندگی دوسرے شخص پر برقرار رہتا۔ ان کی ذات میں بے شمار خوبیاں موجود تھی، جو کسی بھی انسان میں بیک وقت جمع ہونا حیران کن بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات مختلف رنگوں کی عکاس تو تھی ہی لیکن ان سب سے بڑھ کر ان کی ذہانت بھی ہے۔ وہ بہت نرم مزاج، سادہ لباس اور سادہ خوراک تھے۔ چال میں ہمیشہ متانت برقرار رہتی۔ آہستگی سے چلتے اور دھیمے لہجے میں پرسکون انداز سے گفتگو کرتے۔ ان کی شخصیت سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ عام طور پر گرمی اور سردی کے موسم میں ایک ہی طرح کا لباس شیروانی، پاجاما اور پھندے دار ترکی ٹوپی زیب تن کرتے۔ ان کی غزالی آنکھیں چہرے کو مزید جلا بخشتی ہوئی نظر آتیں، پرنور گھنی داڑھی نے وجاہت میں اضافہ کیا ہوا تھا۔ بہت باحیا، ہمیشہ نظریں جھکا کر چلنے کے عادی تھے، گفتگو اتنے سلیقے

اور محبت سے کرتے کہ جو سنتا وہ اسی کے سحر میں کھو جاتا۔ مسرور احمد زئی کے خیال میں:

> ''ملن ساری، انکساری، مہمان نوازی، ادب، پیار، لحاظ، شفقت، احترام تبسم، اعتدال، اعتماد، اعتبار، مٹھاس، امداد، توجہ، دعا، دوا، اخلاص، بے لوثی، اطمینان، احتیاط، ٹھہراؤ، دھیما لہجہ، نرم مزاجی، انتخاب الفاظ، خوش خطی، مطالعہ، مشاہدہ، مسئلہ فہمی، دیانت ریاضت، صداقت، عبادت، امانت، یہ وہ اوصاف اور رنگ ہیں، جن سے آپ کی شخصیت کی تصویر روشن اور مکمل ہوتی ہے۔''(۹)

انھوں نے ساری زندگی نہایت سادگی سے بسر کی۔ وہ سادہ طبع تھے۔ پیر الٰہی بخش کالونی سے سائیکل پر اردو کالج جاتے۔ ایک مرتبہ کالج کے چپراسی نے سائیکل مانگ لی۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً سائیکل چپراسی کے حوالے کر دی یہ سوچ کر کہ وہ دور سے آتا ہے اور سائیکل کی اسے زیادہ ضرورت ہے۔ ہمیشہ یہی کہتے کہ آج کے دور میں ضروریات زندگی میں اضافہ کی وجہ سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کیوں کہ سادہ زندگی ترک کر دی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ اکثر خائف رہتی اور ضرورت سے زائد اشیاء ان کی نظروں سے چھپا لیتی تھیں۔ کیوں کہ ڈاکٹر صاحب ضرورت سے زیادہ کپڑا، لباس یا چادر کچھ بھی ہوتا تو دوسرے کو دے دیتے۔ ڈاکٹر صاحب سے جہاں تک ہوسکتا دوسروں کی مالی مدد کرتے اور انھیں ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے۔ ان کی اپنے حلقے میں موجود افراد سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دعا کرتے تو یہی دعا مانگتے کہ یا اللہ! جس طرح دنیا میں ساتھ رکھا۔ اسی طرح آخرت میں بھی ساتھ نصیب فرما۔ کسی بھی شخصیت کی تکمیل میں اس کا ماحول اور خاندانی پس منظر بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات میں ایک وضع داری ہمیشہ قائم رہی۔ کیوں کہ ان کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں انھیں جینے کا سلیقہ سکھایا گیا۔ وہ انتہائی کم سنی میں باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کے تایا (نذیر احمد خاں) کے کندھوں پر آن پڑی۔ انھوں نے بہ خوبی اور بہ خوشی اس ذمہ داری کو پورا کیا۔ وہ

ڈاکٹر صاحب کی تعلیم وتربیت سے کبھی بھی غافل نہیں ہوئے۔ نذیر احمد خاں (تایا) پوسٹ آفس میں ملازمت کرتے تھے اور اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ ان کی تعلیم پر خرچ کر دیتے۔

اس لیے جیسے ہی ڈاکٹر صاحب نے انجمن ہائی سکول جبل پور سے آٹھویں جماعت پاس کی تو ان کے تایا (نذیر احمد خاں) نے انھیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایک خوددار شخص تھے۔ انھیں یہ خودداری ورثے میں ملی۔ عفت بانو نے گلاب خاں (والد) اور ڈاکٹر صاحب کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ایک بار آپ کے والد (گلاب خاں) انھیں بازار لے گئے وہاں پہلی جنگ عظیم کے سپاہیوں کے پرانے کوٹ فروخت ہو رہے تھے۔ والد صاحب کے ایک دوست نے کہا کہ آپ کا بچہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے۔ اس لیے ایک کوٹ خرید لیجیے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ مجھے ان کا ٹھٹھرنا پسند ہے۔ لیکن غیر کا اتارا ہوا کپڑا نہیں۔ ہاں اگر کسی بزرگ کا اتارا ہوا کپڑا ہو تو یہ پہن سکتا ہے۔''(۱۰)

اگر ان کی تمام زندگی کا جائزہ لیا جائے تو بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بہ وقت ضرورت بھی کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا۔ ضروریاتِ زندگی اتنی مختصر تھیں کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہوتی چاہے حالات کیسے بھی ہوتے۔ سیر وسیاحت کے بہت شوقین تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت سے سفر کیے۔ ڈاکٹر صاحب کی سیر وسیاحت میں دلچسپی تحقیقی کام میں بہت سود مند اور کارآمد ثابت ہوئی۔ کیوں کہ اکثر وبیشتر سفر انھوں نے مطالعہ کی غرض سے کیے جہاں جاتے کتب خانے ان کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ غرض جس شہر میں جاتے وہاں کے سرکاری اور ذاتی کتب خانوں سے استفادہ ضرور کیا کرتے تھے۔ انھوں نے سفر کا آغاز مختلف اغراض ومقاصد کے لیے زمانہ طالب علمی ہی سے کر دیا۔ ڈاکٹر سراج احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

> ''ابا جان کا شروع سے سیر وسیاحت کا بہت شوق تھا لیکن اس سفر وسیاحت کا مقصد لائبریریوں کی کتابوں کا مطالعہ یا کسی درویش بزرگ سے ملاقات یا پھر اولیا کرامؒ، صوفیا کرامؒ کے مزارات پر حاضری دینا، وہاں مراقب ہونا ہوتا۔''(۱۱)

۲۲مئی ۱۹۴۶ءکو وہ با قاعدہ سیاحت کے لیے اپنے منجھلے بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس دوران انھوں نے اٹارسی ،کھنڈوا ، اندوز ، اجین ، جادرہ ، اجمیر شریف، جے پور، دہلی، آگرہ، فتح پور سیکر، افغانستان، بغداد اور نجف تک کا سفر کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے سیونی ، منڈلہ، سلیمن آباد، پناگر، ایلچ پور، ایوت محل،علی گڑھ، جالندھر، رام پور، بریلی ، سعودی عرب،حیدرآباددکن،الہ آباد،بمبئی،لکھنو،کارکوری،بھوپال،برہان پور،پونا،لاہور،اجمیر شریف،کلیر شریف،مظفرنگر،کوئٹہ،مظفرگڑھ،دریاخان،پشاور،مظفرآباد،بالاکوٹ،اوچ شریف، بغدادشریف،کابل،گلگت،ہنزااور سیالکوٹ کا سفر کیا۔انھوں نے حج کی غرض سے بھی سفر کیے۔ بقول ڈاکٹر سراج احمد خاں:

> ''ابا حضور اب تک ۱۵حج کر چکے ہیں۔ان کے مقدس سفر سے بھی بہت معلومات حاصل ہوئی ہیں۔''(۱۲)

وہ بہت بامروت انسان تھے۔ان کی مروت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ہجرت کر کے پاکستان (کراچی) پہنچے تو بغدادی محلّہ پیرالٰہی کالونی میں قیام کیا۔ یہ محلّہ چاکی واڑہ کے قریب ہے۔ جس گھر میں قیام کیا اس کے دروازے اور کھڑکیاں موجود نہ تھیں۔لیکن پھر بھی ہندوستان سے جتنے بھی رشتہ دار اور دوست احباب پاکستان آتے ۔ وہ ان کے گھر ہی پر ٹھہرتے تاوقت ان کو رہنے کے لیے ٹھکانہ مل جاتا۔اگر چہ وہ مکان بہ مشکل چند افراد کے رہنے کے قابل تھا۔ یہ دومنزلہ مکان تھا اور اس کی چھت لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ جب کوئی اس پر چلتا تو محسوس ہوتا جیسے چھت ہچکولے لے رہی ہو۔اس مکان نے پھر بھی بہت سے لوگوں کے لیے جائے عافیت کا کام کیا۔وہ اس گھر میں دس سال تک قیام پذیر رہے۔اس وقت یہ گھر چھوڑا جب انھیں سندھ یونی ورسٹی کی ملازمت ملی ۔ کیوں کہ علامہ آئی آئی قاضی نے ان کے حیدرآباد (۱۹۵۶ء) میں منتقل ہونے پر چھوٹے سے دو کمروں پر مشتمل ایک مکان بھی دے دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ رویہ صرف اپنے رشتے داروں یا دوستوں کے ساتھ نہ تھا بلکہ ہر ملنے والے کے ساتھ یکساں سلوک کرتے۔اتنی اپنائیت کا اظہار کرتے کہ ہر ایک یہی محسوس کرتا جیسے ڈاکٹر صاحب اس سے ہی اتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ ہر کام سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق کرتے تھے اور اکثر یہی کہا

کرتے کہ اگر سنتِ نبوی ﷺ پر عمل کرتے ہوئے کام کی عادت ڈالی جائے تو اس سے جسمانی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور تمام دینی و دنیاوی کاموں میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہر کام وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ پابندیٔ وقت کا خاص خیال رکھتے۔ یونی ورسٹی جانے کے لیے دس منٹ پہلے ہی تیار رہتے۔ اپنا کام خود اپنے ہاتھوں سے کرنا پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی ٹوپی، شیروانی اور پاجاما خود دھو کر استری کرتے اور جوتے صاف کرتے۔

انھوں نے کبھی بھی اپنے حوالے سے کسی کو تکلیف نہیں دی۔ ڈاکٹر صاحب بہت مہمان نواز تھے۔ ان کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہر کھانے پر ان کے کچھ نہ کچھ دوست ضرور موجود ہوتے۔ لوگ ان کے گھر آنا پسند کرتے تھے۔ یونی ورسٹی کی ملازمت کے دوران جب حیدر آباد میں رہائش پذیر ہوئے تو دوپہر کا کھانا گھر ہی پر کھاتے۔ یونی ورسٹی سے واپسی پر عموماً دو دوست ان کے ہم راہی ہوتے۔ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھاتے۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ لیکن کبھی بھی انھوں نے ناگواری کا اظہار نہ کیا۔ بعض اوقات لوگ بلا وجہ اور بے وقت انھیں تکلیف پہنچاتے لیکن ڈاکٹر صاحب کا مزاج ایسا تھا کہ دوسرا محسوس ہی نہیں کرتا تھا کہ انھیں کوفت ہوئی ہے۔ اس لیے بلا جھجک ان کے دروازے پر موجود ہوتے۔ دوستوں کے لیے ملاقات کا وقت متعین نہ تھا نہ ہی دن اور رات کی تخصیص تھی۔ ڈاکٹر سراج احمد خاں نے ایک صاحب کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ ۱۱ بجے پسینجر ایکسپریس پر کراچی سے حیدر آباد کے لیے سوار ہوتے۔ دو بجے حیدر آباد پہنچتے دروازے پر دستک دیتے، کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ ان کی وجہ سے تمام گھر والے بیدار ہو جاتے۔ ایک عرصہ تک ان کا یہ معمول رہا۔ اگرچہ گھر والوں نے ان سے معذرت کر لی کہ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے البتہ ڈاکٹر صاحب خندہ پیشانی سے ہی ملتے رہے۔ کیوں کہ ان کی ذات میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب عالی ظرف تھے۔ اس لیے لوگ وقت بے وقت تنگ کرتے رہتے لیکن وہ ہمیشہ خوشی کا اظہار کرتے نظر آتے۔ اس حوالے سے کئی واقعات ان سے منسوب ہیں۔ ایک صاحب نے حرم شریف میں دعا مانگی کہ اگر وہ اپنے گھر (حیدر آباد) بخیر و عافیت پہنچ جائے گا تو پہلے ڈاکٹر

صاحب سے ملے گا۔ تین بجے وہ ملنے ان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خوب زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ ڈاکٹر صاحب بیمار تھے اور آرام کر رہے تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی ان سے محبت سے ملے اور خوشی کا اظہار کیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک خاتون کراچی میں فوت ہوئی۔ اس نے وصیت کی کہ ان کی نماز جنازہ ڈاکٹر صاحب پڑھائیں۔ خاتون کو حیدرآباد دفن کیا جانا تھا۔ خاتون کے ورثا ڈیڑھ بجے اس کی میت لے کر ان کے دروازے پر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً وضو کیا اور نماز جنازہ پڑھا دی۔ اس طرح کے کئی واقعات ان کی زندگی میں ملتے ہیں، جس میں دوسروں کی خاطر کبھی انھوں نے اپنی ذات کو فوقیت نہ دی۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی بڑھاپے میں بھی عبادت وریاضت میں مشغول رہے اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے۔

لوگوں کی ایک کثیر تعداد ان کی معتقد تھی۔ بڑھاپے میں کمزوری بڑھ گئی لیکن ملنے والوں کی تعداد میں کمی نہ ہوئی۔ لوگ اسی تواتر سے ان سے ملنے آتے کبھی دعا کی غرض سے اور کبھی سفارش کرانے۔ طلبہ وطالبات کے ساتھ ان کا خاص انداز کا مشفقانہ رویہ تھا۔ طلبہ وطالبات سے کتابوں کا باہم تبادلہ بھی ہوتا رہتا، کبھی بھی وہ ناراضی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ لوگ ان کی ناراضی سے خوف زدہ نہیں تھے کہ وہ ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب وفات سے قبل بہت بیمار ہو گئے لیکن ملنے والے لوگوں کی تعداد میں کمی نہ ہوئی۔ ان کے گھر والے معذرت کا اظہار کرتے۔ اس کا حل ملنے والوں نے یہ نکالا کہ وہ اپنی بیگمات کے ساتھ ان کے گھر آتے تاکہ بیگم تھوڑی دیر گزرنے کے بعد اپنے شوہر نامدار کو بھی بلا لے۔ لوگوں کا یہ طرز عمل صرف اور صرف ان سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے تھا۔ ملنے جلنے والوں کا تانتا ان کے گھر پر بندھا رہتا۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ اکثر لوگ ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں سے یہ تقاضا کرتے کہ اگر وہ سو بھی رہے ہیں تو انھیں جگا دیں کیوں کہ ان کا نام سنتے ہی وہ اٹھ جائیں گے اور خوش ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کسی بھی معاملے میں کسی دوسرے کو موردِ الزام نہ ٹھہراتے تھے۔ اپنی کتابوں کی خود حفاظت کرتے۔ وعظ کی نسبت عمل کرنے کے قائل تھے۔ کھانا ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھاتے اور کھانے کے بعد عموماً میٹھی چیز کھانا پسند کرتے۔ خود کم کھاتے لیکن دوسروں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی دوسرا کوئی چیز نہ کھاتا تو انگلی سے اشارہ کرتے اور کہتے کہ اگر

اسے نہ کھائیں گے تو یہ کیا کہے گی۔شگفتہ مزاج ایسے کہ مٹھائی اس محبت بھرے انداز سے پیش کرتے کہ اگر میٹھی نہ ہوتو نہ کھایئے گا۔مسرور احمد زئی ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ مزاجی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''آپ کی ایسی تحریریں بھی ہیں جن میں شگفتہ بیانی ، بذلہ سنجی اور شائستگی کے ساتھ پُر لطف واقعات اور جملے بھی خوب ملتے ہیں ۔ یہ رنگ صرف تحریروں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی گفتگو میں بھی پرلطف جملے اور طنز ومزاح کا لطیف انداز دیکھنے میں آتا ہے۔جس سے ڈاکٹر صاحب کی پر بہار اور پراثر شخصیت کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔''(۱۳)

ڈاکٹر صاحب دوسروں کو تحفے وتحائف دینا پسند کرتے ۔ ہمیشہ تحائف دینے میں پہل کرتے ۔ جب بھی کسی کے گھر جاتے تو پھل ، کپڑے یا کھانے پینے کی اشیا ساتھ ضرور لے کر جاتے ۔ڈاکٹر صاحب سراپا محبت تھے۔جس شخص کا ملنے جلنے والوں سے محبت کا یہ عالم ہو اس کا اپنے بچوں کے ساتھ رویہ کتنا ہمدردانہ ہوگا۔ وہ اپنی بہوؤں اور پوتے پوتیوں سے بہت شفقت سے پیش آتے ۔اگر ان کی اولاد میں سے کسی کو گھر آنے میں تاخیر ہوجاتی اس پر بے چین ہوکر بہوؤں سے شکوہ شکایت کرتے اور ان کی غیر حاضری پر رنجیدہ ہوجاتے ۔

ڈاکٹر صاحب ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ انتہائی شفیق رویہ اپناتے ۔یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے ہزاروں قدر دان موجود ہیں۔اولاد کی طرح اپنے شاگردوں کا خیال رکھتے ۔لوگ اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے مسئلے اور چھوٹے سے چھوٹے کام میں ان سے رہ نمائی لیتے ۔ بچے کی ولادت پر اس کا نام تجویز کراتے ،نوکری کے لیے دعا کراتے ،نوکری مل جاتی تو مزید بہتری کے لیے دعا کراتے ، گھریلو حالات بہتر ہوجانے کی دعا اور کاروبار کے لیے دعا۔غرض ڈاکٹر صاحب کے یہاں دعا کا ایک سلسلہ قائم رہتا۔بعض باتیں ایسی ہیں ،جن کی نصیحت بار بار کیا کرتے ۔مثال کے طور پر اکثر کہا کرتے کہ نمازِ فجر کے بعد گھر کے ہر فرد کو قرآن کریم کی تلاوت کرنی چاہیے ۔انھیں کم کھانا،کم سونا اور کم گفتگو کرنا پسند تھا۔اس پر وہ خود بھی عمل کرتے اور دوسروں کو بھی تلقین کیا کرتے ،کھانے کے حوالے سے ہمیشہ کہتے کہ معدے پر بوجھ نہ ڈالیں تا کہ بیماریوں

سے بچے رہیں۔اس کے لیے معدے کو تین برابر حصوں میں تقسیم کریں۔ایک حصہ کھانے کا دوسرا ہوا اور تیسرا حصہ پانی کا۔کبھی ماہر نفسیات نظر آتے ہیں۔بچوں کے معاملے میں کہتے کہ ان سے محبت کرو بلا وجہ تعریف کرو۔تا کہ نفسیاتی طور پر بہتر ہو سکیں کیوں کہ وہ سوچیں گے کہ ان کے اندر تو ایسی کوئی خصوصیات موجود ہی نہیں ہے، جو ان کے متعلق بیان کی جا رہی ہیں۔اس کے بعد یقیناً وہ ویسا ہی کرنے کی کوشش کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔انھیں خود کو نمایاں کرنے کے لیے تگ ودو کی ضرورت نہیں تھی۔پابندی وقت کے اس قدر قائل تھے کہ ہاتھ پر گھڑی باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔رات کے تیسرے پہر تین یا ساڑھے تین بجے نیند سے بیدار ہونا ان کے معمولات میں شامل تھا۔اس پر تمام عمر وہ سختی سے کاربند رہے۔

رات کو جگانے کا آغاز ان کے بڑے بھائی نذیر احمد خاں نے کیا۔اگرچہ اس وقت انھیں اٹھنا اچھا نہیں لگتا تھا لیکن آہستہ آہستہ جلدی اٹھنے کی عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ اپنے بڑے بھائی (نذیر احمد خاں) کی نصیحت یاد رہتی کہ اگر رات کے آخری پہر میں اٹھ کر کچھ پڑھا جائے تو وہ بھولتا نہیں۔

نماز فجر سے تین گھنٹے پہلے اٹھتے، ورزش کرتے۔ورزش میں مگدر چلاتے، بڑھاپے میں زیادہ کمزور ہونے کی وجہ سے مگدر چلانا چھوڑ دیا لیکن ڈنڈ بیٹھک ضرور لگاتے رہے۔ورزش کے بعد وضو کرتے اور نماز تہجد ادا کرتے۔تہجد میں لمبا رکوع وسجود کرنے کے عادی تھے۔اس سے انسان نسیان اور دل کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔نماز تہجد کے بعد لمبی دعا کیا کرتے تھے، جس میں ان کی کوشش ہوتی کہ ایک ایک شخص کا نام لیں۔نماز تہجد کے بعد قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔قرآن پاک ہمیشہ ترتیب وار پڑھتے یعنی اسلامی تاریخ کے پہلے دن سے شروع کرتے اور پھر اسی تسلسل سے پڑھتے اور اختتام کرتے۔ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کہا کرتے کہ یہ قرآن پاک کی تلاوت کی برکت ہے کہ انھیں بڑھاپے اور کمزوری میں بھی چشمے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

قرآن پاک کے ایک پارہ کی تلاوت کے بعد ایک مرتبہ سورہ مزمل، ایک تسبیح کلمہ، استغفر اللہ اور درود پاک پڑھتے تھے۔اس کے بعد کچھ دیر مراقبہ کرتے۔ مراقبہ کے بعد فجر کی سنتیں گھر پر ادا کرتے لیکن فرض ہمیشہ مسجد میں ادا کیا کرتے۔ فجر کے بعد سونے پر سخت ناراضی کا اظہار کرتے کہ اس سے رزق کی تنگی ہوتی ہے اور قرآن پاک کی درج ذیل آیت کا حوالہ دیتے:

ترجمہ: ''اپنے رب کی حمد و تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے''

نماز فجر چوں کہ مسجد میں ادا کرتے تھے اور گھر کے قریب مسجد بھی نہیں تھی اس لیے دو آبہ پولیس لائن میں نماز ادا کرتے۔ نماز فجر کے بعد اشراق تک مراقبہ کرتے۔ مراقبہ شروع کرنے سے پہلے درود پاک تین مرتبہ، سورہ فاتحہ ایک مرتبہ، سورہ اخلاص گیارہ مرتبہ پڑھ کر ایصال ثواب کیا کرتے تھے۔

مراقبہ کے بعد دو نفل اشراق نماز کے ادا کرتے۔ نماز اشراق ادا کرنے کے بعد مسجد سے گھر آنے کے لیے صبح کی سیر کی غرض سے سڑک کی طرف چل نکلتے۔ چہل قدمی کے دوران عموماً چار پانچ دوست ان کے ساتھ ہوتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان میں زیادہ تر وہ اصحاب ہوتے، جو دعا کی غرض سے آتے۔ ڈاکٹر صاحب وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اٹھا کر ان کے لیے دعا کر دیتے۔ دعا کرانے والے لوگوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کے لوگ اتنے بڑھ گئے کہ انھیں چہل قدمی ترک کرنا پڑی۔ پھر مسجد سے سیدھے گھر آنے لگے۔ گھر آ کر دو مرتبہ سورہ مزمل کی تلاوت کرتے اس کے بعد تھوڑی دیر توقف کرتے اور پھر سات بجے ناشتہ کرتے۔ ناشتے کے بعد لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہو جاتے لیکن ساتھ ساتھ اگر کوئی دعا کرانے یا تعویز لینے آ جاتا تو یہ کام بھی کرتے جاتے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں:

> ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے نزدیک کسی مذہب کا، کسی نظریے کا، کسی عقیدے اور مسلک کا، کسی علاقے کا، کسی عمر کا کوئی شخص ہو، اگر جائز کام ہو اور اس کی بھلائی کے لیے ہو، ڈاکٹر صاحب کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہ ان کا خاص مسلک ہے اور اسی کو انسانی مسلک کہا جاتا ہے۔'' (۱۴)

دوپہر ایک بجے تک اسی تسلسل سے کاموں میں مشغول رہتے۔ایک بجے کھانا کھاتے جوآدھی روٹی پر مشتمل ہوتا۔کھانے میں جھینگا،گردے،پھیپھڑے اوراوجھڑی ناپسند کرتے تھے۔کھانا ہمیشہ سنت کے مطابق سرڈھانپ کرکھاتے۔کھانے کے بعد پلیٹ اتنی صاف ہوتی کہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ اس میں کھانا بھی کھایا گیا ہوگا۔نماز ظہر کھانا کھانے کے بعد مسجد میں ادا کرتے لیکن وفات سے قبل کمزوری کی وجہ سے گھر ہی پر ادا کرنے لگے۔سنت نبویﷺ کے مطابق دوپہر کو آدھ پون گھنٹہ آرام ضرور کرتے۔اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے:حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں تھوری دیر قیلولہ کرنا ہزار نفل نماز سے بہتر ہے۔

خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیتے۔انھوں نے وقت کی تقسیم اس طرح کررکھی تھی کہ کوئی بھی کام ان کے لیے باعث تکلیف نہ ہوتا۔عصر سے پہلے عموماً خطوط کے جواب دیتے۔روزانہ ۲۰ سے ۲۵ خطوط آتے،جن کے جوابات دیتے اوراتنی ہی تعداد میں مسجد سے پرچیاں آتیں ان کے جوابات بھی دیتے۔گرمیوں میں نماز عصر سے پہلے اپنے کپڑے(لباس کے علاوہ رومال اورٹوپی)دھوتے اورغسل کرتے۔سردیوں میں پیراور جمعہ کے دن غسل کرتے تھے۔اس کے بعد چائے پیتے اورنماز عصر مسجد میں ادا کرتے۔مسجد میں لوگوں کے لیے اجتماعی دعا ہوتی اور مسجد سے باہر آکرعورتوں کے لیے اجتماعی دعا کیا کرتے۔

بیالیس سال تک ڈاکٹر صاحب کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ان کا یہ معمول رہا کہ عصر کے بعد گھر سے ملحقہ کمرے(بیٹھک)میں تشریف فرما رہتے۔جہاں لوگوں کے مسائل سنتے اوردعا کرتے۔وفات سے قبل مغرب کی نماز گھر پر ادا کرنے لگے۔مغرب کے فرض اورسنت کے بعد چھ رکعت نفل اوابین ادا کرتے۔چار رکعت ایک سلام سے پڑھتے اوردورکعت ایک سلام سے ادا کرتے۔

عشا کی نماز سے پہلے کھانا کھاتے اورپھر گھر ہی پر نماز ادا کرتے۔پہلے ساری نمازیں مسجد میں ادا کیا کرتے تھے۔ہمیشہ اس حدیثِ مبارکہ ﷺ کا حوالہ دیتے کہ جس شخص نے عشا کی نماز مسجد میں ادا کی گویا اس نے آدھی رات عبادت کی اور جس نے فجر کی نماز باجماعت ادا کی

گویا اس نے پوری رات عبادت کی۔ عشا کی نماز کے بعد اکثر جلدی سو جاتے اور دوسروں کو بھی جلد سونے کی تاکید کرتے اس لیے کہ عشا کے فوراً بعد سونا بہتر ہے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عشا کے بعد کسی سے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب سونے سے پہلے ایک مرتبہ الحمد شریف اور تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر آپ ﷺ کی روح کو ایصال ثواب پہنچاتے۔ اس سے برے خواب نہیں آتے اور یہ تسبیحات سونے سے قبل پڑھنا بہت بابرکت ہیں۔ موسیٰ بھٹو لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ کی ذات گرامی کا اہم اور روشن پہلو یہ ہے کہ آپ قرآن کریم فرقان حمید کی عملی تفسیر یعنی نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے مطابق زندگی بسر فرمانا سب سے افضل اور ممتاز نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ اس پر الحمدللہ عمل پیرا بھی ہیں اور دوسروں کو اس راہ حق پر چلنے کی تبلیغ و تحریک بھی دیتے ہیں۔''(۱۵)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ہمارے عہد کے غیر معمولی بزرگ تھے، جن کی تمام زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ آج بھی اللہ کی بزرگ ہستیاں دنیا میں موجود ہیں جو احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگیاں گزار رہی ہیں۔ ان کی ذات میں یہ بزرگانہ صفات انھیں والدین سے ورثے میں ملیں (کیوں کہ ان کے والد، گلاب خاں) پرہیزگار بزرگ تھے۔ اسی لیے محمد اشرف علی تھانوی نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے والد (گلاب خاں) سے بہت متاثر تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ تعلیم مکمل کر کے علی گڑھ سے واپس آئے تو انھوں نے انگریزی میں اپنے والد (گلاب خاں) کے لیے ایک نظم لکھی۔ نظم ملاحظہ ہو:

"O father dear, why lefeth me?
with having cries i look for thee
with wailings warm my tears i cast
with despaired signs, will breath my last" (16)

اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر ان کے والد کے کتنے گہرے

اثرات تھے۔ یہاں تک کہ جب گلاب خاں (والد) بہت بیمار ہوئے تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو پاس بٹھایا اور نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا۔ اس کے علاوہ دعائیں یاد کرائیں۔

ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ (محفوظ النساء بیگم) بھی ایک درویش صفت خاتون تھی۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

> ''میں ابھی چھوٹا تھا کہ ہمارے شہر میں طاعون کی بیماری پھیلنا شروع ہوگئی، جس میں روزانہ بیسیوں افراد موت کا شکار ہونے لگے۔ میری والدہ کا کہنا تھا کہ تم صبح سے شام تک جتنے بھی مرنے والے مسلمانوں کی نماز جنازہ میں شرکت کر سکتے ہو کرو۔ چناں چہ والدہ کی ہدایت پر میں کئی ہفتوں صبح سے شام تک یہ کام کرتا رہا۔''(۱۷)

ان کی والدہ محترمہ (محفوظ النساء بیگم) انھیں تلقین کرتی رہتیں کہ جب بھی کسی مسلمان کی وفات کی خبر سنو تو سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کی روح کو ایصال ثواب ضرور کیا کرو۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر اس پر سختی سے عمل کیا۔ بڑھاپے میں جب وہ جنازے میں شرکت کرنے کے قابل نہ رہے تو لوگ اکثر میت اٹھا کر گھر لے آتے۔ تب وہ گھر پر اس کی نماز جنازہ ادا کر دیتے۔ ان کی والدہ محترمہ (محفوظ النساء بیگم) اور والد محترم (گلاب خاں) کے بعد جس ہستی نے ان کی تربیت میں بھر پور کردار ادا کیا وہ ان کے بڑے بھائی (نذیر احمد خاں) ہیں۔ کیوں کہ گلاب خاں (والد) کا انتقال بہت جلد ہوگیا۔ جب ابھی ان کی عمر آٹھ سال تھی۔ گلاب خاں کی وفات کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری نذیر احمد خاں (بڑے بھائی) کے کندھوں پر آن پڑی۔ نذیر احمد خاں (بڑے بھائی) نے انھیں رات کے آخری پہر جاگنے کی تلقین کی اور انھیں بتایا کہ رات کا یہ پہر بہت بابرکت ہوتا ہے۔ نوافل اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد جو بھی کام شروع کیا جائے اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اگر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کو دیکھا جائے تو ان کی تمام زندگی خیر و برکت کا نمونہ نظر آتی ہے، جس کی بنیادی وجہ ان کی بچپن کی تربیت ہے۔ اسی لیے انھوں نے روح کو مادہ پر ترجیح دینا شروع کر دیا اور روحانیت ان کی ذات کا جزو بن گئی۔

ہندوستان میں قیام کے دوران وہ بہت سے نام نہاد پیروں کو دیکھ چکے تھے اور کسی حد تک دل برداشتہ بھی ہوئے۔ اس لیے کبھی کسی کے پاس نہ گئے۔ پاکستان آنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں ان کی ملاقات سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ زوار حسین شاہ صاحب سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اسی کے ساتھ پہلے دن ہی سے کشف و کرامات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا عبدالغفور مدنیؒ سے بھی کسبِ فیض کیا۔

ڈاکٹر سراج احمد خاں کے مطابق:

> ''آپ پہلے تو پیری مریدی کے قائل نہ تھے لیکن جب سے صوفی محمد احمد (مرحوم) اور حضرت شاہ زوار حسین صاحب مرحوم سے ملے ہیں اس وقت سے آپ نے نقش بندیہ سلسلہ میں بیعت فرمائی ہے اور اتنی زیادہ محنت کی کہ ان کے پیر صاحب نے انھیں خلافت دے دی۔ آج اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہزاروں مرید، لاکھوں شاگرد اور شاگرد بھی ایسے جنھوں نے اردو دنیا میں نام پیدا کیا۔''(۱۸)

ڈاکٹر صاحب چوں کہ پہلے ہی ایک تربیت شدہ صوفیانہ مزاج کے مالک تھے۔ اس لیے بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے، جس کے بعد ان کی زندگی لوگوں کے لیے ہدایت اور راہ نمائی کا ذریعہ بن گئی۔ بے پناہ علمی و ادبی سرگرمیوں کے باوجود انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً چالیس سال اس طرح گزارے کے لوگ بدستور ان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ سید زوار حسین شاہ صاحب کے حکم سے حیدر آباد منتقل ہوئے اور سلسلہ نقش بندیہ کی تبلیغ شروع کر دی۔

ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مندوں میں حاجت مند، امرا، سفارش کرانے والے اور طالب علم سبھی شامل تھے۔ غرض لوگوں کا ایک ہجوم ان کے اردگرد جمع رہتا۔ ان کے عقیدت مند ایسے بہت سے افراد تھے جن سے وہ ذاتی اور مادی فوائد حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے مادہ پرستی کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ دائمی اور اخروی زندگی کو پیش نظر رکھا۔ وہ ایثار و تعاون کے قائل تو تھے ہی ان میں قوت برداشت اور حوصلہ بھی بلا کا تھا۔

پروفیسر احمد اقبال نے ان کی قوت برداشت کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ سندھ یونی ورسٹی کے ایک استاد کسی معاملے میں ان سے ناراض ہوگئے چناں چہ ان کے خلاف مہم چلانا اور ان کے خلاف ذہن بنانا ان کا معمول بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب تک یہ باتیں پہنچتی رہیں، یہاں تک کہ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ کون سا استاد ان کے خلاف محاذ آرائی کر رہا ہے۔ اس کے باوجود جب بھی ان سے سامنا ہوتا محبت کا اظہار کرتے۔ جس کی وجہ سے اس استاد نے ناراضی ختم کر دی۔ یہ اور اس طرح کے کئی واقعات ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ملتے ہیں، جس سے ان کی قوت برداشت اور بلند حوصلگی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے درحقیقت زندگی کا رزا پالیا تھا۔ جس کی طرف موسیٰ بھٹو نے بھی اپنے ایک مضمون میں اشارہ کیا ہے اور جب کوئی ان کی صحبت میں وقت گزارتا تو وہ بھی اس راز کو پالیتا کہ زندگی کی تین سطحیں ہیں، جس کی طرف قرآن پاک میں بھی اشارہ ملتا ہے۔ پہلی سطح وہ ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ:

''اور کافر کھاتے پیتے ہیں اور لذت حاصل کرتے ہیں، جس طرح جانور
کھاتے پیتے ہیں، ان کے رہنے کی جگہ دوزخ کی آگ ہے۔''

دوسری سطح ایسی ہے جس میں کچھ احکام پر عمل کرنے اور کچھ کو چھوڑ دینے کا معاملہ ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ:

''بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، کہو کہ تم اب تک ایمان نہیں لائے،
بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا ہے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں
داخل نہیں ہوا ہے۔''

تیسری سطح ایمان وعقیدہ کی ہے یعنی مکمل ایمان داری اور خلوص نیت سے اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ترجمہ:

''جو لوگ ایمان لائے، برائیوں سے بچتے رہے اور نیکیاں کرتے رہے۔

ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوشی کا سامان ہے تو آخرت میں بھی۔''

ڈاکٹر صاحب کی زندگی اسی عبادت و ریاضت کے زیرِ اثر نظر آتی ہے۔ انھوں نے قرآن مجید اور سنتِ رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے زندگی گزاری۔ آٹھ سال کی عمر سے تلاوتِ قرآن کا آغاز کیا اور پھر کبھی اس میں تاخیر نہیں کی۔ تین چیزوں کو کثرت سے پڑھنے کی تلقین کرتے، درود پاک، نماز اور قرآن پاک۔ وہ حتیٰ الامکان کوشش کرتے کہ کسی کا احسان نہ اٹھائیں، موسیٰ بھٹو کے مطابق:

> ''کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک کتاب کمپوزنگ اور اشاعت کے لیے میرے حوالے کی اور فرمایا کہ یہ کتاب آپ اپنے ادارے سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ کی طرف سے شائع کریں۔ کتاب چھپ گئی تو ڈاکٹر صاحب نے جملہ اخراجات کی ادائیگی کی ہدایت فرمائی جس پر میں نے انھیں تفصیل سے خط لکھا کہ ادارہ آپ کی دعاؤں سے چل رہا ہے، جس پر ڈاکٹر صاحب نے خاموشی فرمائی...... بہر حال تقریباً گیارہ ہزار روپے کی رقم تھی، جو ہمیں ادا کی گئی۔''(۱۹)

اسی طرح سے ڈاکٹر صاحب کے احباب نے ان کی کتابوں کی اشاعت کے لیے ایک ادارہ قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے ان کے حلقے سے وابستہ افراد سے ایک ایک سو اور ایک ایک ہزار روپے لیے گئے، لیکن یہ ادارہ اشاعتی کام شروع نہ کرسکا، جس کی وجہ سے اس ادارے کو بند کردیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تمام احباب کی رقوم منافع سمیت واپس کردیں۔ حالاں کہ انھوں نے ادھار نہیں دیا تھا بلکہ تعاون کیا تھا۔ وہ علم وادب اور فہم وفراست کا مجموعہ تھے۔ کسی بھی شخصیت میں اتنے اوصاف کا جمع ہونا معجزے سے کم نہیں۔ ہر معاملے میں وہ تین باتوں کا خیال رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے لیے عمل کرنا، بچوں سے پیار اور بڑوں کا احترام کرنا۔ مدینہ منورہ کے حوالے سے کسی کتاب کی اشاعت کا ذکر سنتے تو ایسے خوشی کا اظہار کرتے جیسے انھیں مل گئی ہو چاہے نہ ملے۔

تین چیزوں کو سختی سے ناپسند کرتے تھے۔ سگریٹ نوشی، عبادت میں غفلت اور کسی کو تکلیف پہنچانا۔ تین خبریں ایسی تھیں جب بھی سنتے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے، درود پاک، نماز اور کتاب تین چیزوں کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتے۔ اپنے ملک (پاکستان) کے لیے مسلمانوں کے لیے اور اپنے مرحوم رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے۔ وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مصروف دعا رہتے۔ اپنی والدہ محترمہ کے متعلق بتاتے کہ وہ ان الفاظ میں ان کے لیے دعا کیا کرتیں؛ اللہ رب العزت انھیں راہ چلتے عزت دے۔ یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ جہاں سے ڈاکٹر صاحب کا گزر ہوتا ایک ہجوم جمع ہو جاتا۔ ان کے گھر کے دو دروازے تھے جن پر مسلسل دستک ہوتی رہتی۔ ان میں بڑے بڑے افسروں سمیت عام لوگ بھی شامل ہوتے۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے۔ سابق صدر مملکت اسلامی جمہوریہٗ پاکستان ضیاء الحق سمیت کئی اعلیٰ عہدہ داران کے معتقد تھے۔ سادگی اور پاکیزگی ان کی ذات کے نمایاں وصف تھے۔ گفتگو کرتے ہوئے بھی اس بات کا خیال رکھتے کہ زبان آسان اور قابل فہم ہو لفظوں کا انتخاب ایسا ہوتا، جو سننے والے کو بآسانی سمجھ میں آ جاتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے پاس مشکل الفاظ موجود ہی نہ ہوں لیکن ایسا بالکل بھی نہیں تھا وہ صرف سننے والے کو مشکل میں نہیں ڈالتے تھے اور اس کی آسانی کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ ان کے الفاظ کا چناؤ سلجھا ہوا اور مختصر ہوتا۔

ہر مہینے اپنی ڈاڑھی کے بال کٹواتے اور سر کے بال استرے سے صاف کراتے۔ ڈاکٹر صاحب اکثر کہا کرتے کہ حلق کے اوپر کے یعنی داڑھی کے نیچے کے بال اگر استرے سے صاف کروائے جائیں تو حلق کی بیماریاں پیدا ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ان کا سفری سامان عموماً چند ایک اشیاء پر مشتمل ہوتا، جس میں ایک دو جوڑے کپڑوں کے علاوہ کنگھی، سوئی، دھاگہ، مسواک اور لوٹا شامل ہوتا۔

گفتگو میں بہت رکھ رکھاؤ، تہذیب اور شائستگی جھلکتی ہوئی نظر آتی۔ آہستگی اور نرمی کے ساتھ بات کرتے۔ اسی لیے ان کی باتیں دلوں کو تسخیر کر لیتی تھیں۔ اگرچہ لوگ بے تحاشا سوالات کرتے۔ ڈاکٹر صاحب سوالات کے جواب انتہائی محبت اور خندہ پیشانی سے دیتے۔ اس میں ایسا

رویہ اختیار کر لیتے جیسے مباحثہ ہو رہا ہو اور وہ خود بھی سوال کرنے والوں سے کچھ سمجھ رہے ہوں۔ بڑے بڑے عالمانہ موضوعات پر سیدھے سادھے اور عام فہم انداز سے گفتگو کرتے۔ انھوں نے ہمیشہ سیاسی اور مذہبی گروہ بندی سے خود کو دور رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے آستانے پر ہر سیاسی اور مذہبی گروہ سے تعلق رکھنے والا موجود ہوتا۔

انھیں شاعری سے بھی لگاؤ تھا لیکن انھوں نے شاعری کو باقاعدہ اپنایا نہیں البتہ تاریخی قطعات لکھتے رہے۔ تراجم میں بھی اس بات کا خیال رکھتے کہ نثر اور اشعار کے ترجمہ میں فرق برقرار رہے۔ اسی لیے نثر کا ترجمہ نثر میں اور اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری میں دل چسپی کی وجہ سے مکتوبات امام ربانی قدس سرہ کے فارسی اشعار کا منظوم ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب زبردست قوت حافظہ کے مالک تھے۔ انھیں زندگی کے بیشتر واقعات پوری تفصیل کے ساتھ بڑھاپے اور کمزوری میں بھی یاد تھے جب کہ عام شخص کا حافظہ اس عمر میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور کرم نوازی تھی۔ اسی لیے ان کے اندر بہت سی ایسی خصوصیات موجود تھیں، جو عام لوگوں میں بیک وقت جمع ہونا مشکل ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے نانا (عبدالقادر خاں جن کا انتقال ان کی پیدائش سے بیس برس پہلے ہو چکا تھا) سے منسوب ایک واقعہ بیان کیا کرتے تھے کہ وہ ان کے خواب میں آئے اور انھیں نصیحت کی کہ صبح نہار منہ تھوڑی سی شکر میں زعفران کی چند ایک بالیاں رکھ کر کھا لیا کرو۔ اس سے قوت حافظہ میں اضافہ ہوگا۔ اس کے بعد یہ ان کا معمول بن گیا۔ ان کی یادداشت اتنی بڑھ گئی کہ کوئی ان کے مقابلے پر ٹھہر نہ سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے منسوب چند ایک واقعات حج اور مدینہ منورہ سے متعلق یہاں درج کیے جا رہے ہیں، جو ان پر اللہ کی خاص نظر کرم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی والدہ محترمہ (محفوظ النساء بیگم) عصر کی نماز کے بعد بس میں سوار ہو کر مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ بس میں متعین تعداد سے زائد دو افراد سوار تھے۔ اس لیے بس کو قریبی چیک پوسٹ پر روک لیا گیا اور ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا کہ بس کو واپسی اسی مقام پر

بھیج دیا جائے جہاں سے روانہ ہوئی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب اور ان کی والدہ کو بس سے اتار دیا گیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے اور فوراً حضور اکرم ﷺ سے اپنا حال بیان کیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک افسر آیا اور کہنے لگا کہ ان دو افراد کو بھی بس سے نہ اتارا جائے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مدینہ منورہ جاتے ہوئے ان کی بس خراب ہوگئی۔ شدید گرمی اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ انھیں پریشان حال کھڑے ہوئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک شخص آکر پکارنے لگا کہ آپ میں سے، جو کوئی بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ہے وہ اپنے ساتھیوں سمیت ہمارے ٹرک میں آکر سوار ہو جائے۔ کیوں کہ بس کو ٹھیک ہونے میں ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ لہٰذا بس ٹھیک ہو کر وہیں پہنچ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب حیرت زدہ رہ گئے۔ انھوں نے جب اس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو اور تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا اور مجھے کیسے جانتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ ان کی مدد کرنے کا اشارہ اسے حضور ﷺ کی طرف سے ملا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب مدینہ منورہ ہی میں موجود تھے کہ ان کے پیسے ختم ہوگئے۔ یہاں تک کہ جدہ جانے تک کے لیے بھی رقم موجود نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے انتہائی پریشانی کے عالم میں حضرت محمد ﷺ سے دعا میں درخواست کی۔ ابھی وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچ بھی نہ پائے ہوں گے کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میرے یہ پیسے رکھ لیں پاکستان جا کر میرے بھائی کو دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس رقم سے اپنی ضرورت پوری کر لی اور پاکستان جا کر اس کے بھائی کو رقم ادا کر دی۔

مدینہ منورہ میں ایک بہت ہی ضعیف اور کمزور بوڑھا شخص ان کے پاس آیا۔ وہ پاکستان واپس آنا چاہتا تھا لیکن اس کی واپسی ڈاکٹر صاحب کے گروپ کے بعد تھی۔ وہ ہر حال میں انھیں کے ساتھ ہی پاکستان آنا چاہتا تھا۔ اس بات پر بہت رنجیدہ تھا کہ اس کا کوئی ساتھی بھی نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے حضرت محمد ﷺ سے دعا میں گزارش کی۔ اس کے بعد جیسے ہی اپنی قیام گاہ پر پہنچے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور آکر اس نے بوڑھے شخص کا ٹکٹ مانگا۔ ٹکٹ لے کر جانے کے تھوڑی دیر بعد واپس لے آیا۔ دیکھا تو ٹکٹ پر وہی تاریخ درج تھی، جس تاریخ پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے گروپ کے ساتھ واپس آنا تھا۔ یہ اور اس طرح کے کئی واقعات انھیں حقیقت میں

آپ ﷺ کا غلام ثابت کرتے ہیں۔ جہاں کہیں انھیں کوئی مشکل پیش آتی فوراً غیبی امداد پہنچتی اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔

وہ ہر ایک کے ساتھ یکساں اور نرم رویہ اختیار کرتے۔ ان کی نرم مزاجی کا لوگوں نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا لیکن جیت ہمیشہ ڈاکٹر صاحب ہی کی ہوتی۔ ان کی محبت اور نرمی کے سامنے کوئی ٹھہر نہ پاتا۔ ان کی زندگی پاکیزگی اور سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ وہ ایک آئیڈیل استاد بھی تھے۔

سندھ یونی ورسٹی میں ملازمت کے دوران شعبہ اردو میں بہت گہما گہمی تھی۔ ان کے قول وفعل میں تضاد نہیں تھا۔ وہ ایک بہترین استاد تھے۔۱۹۶۳ء میں سندھ یونی ورسٹی (اولڈ کیمپس) سیشن کورٹ کے سامنے تھی۔ سندھ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد زیر تعلیم تھی۔ یہ تعداد یونی ورسٹی کی اردو کی مخصوص نشستوں سے کہیں زیادہ ہوتی۔ اس کی وجہ ڈاکٹر صاحب تھے کیوں کہ شعبۂ اردو (سندھ یونی ورسٹی) کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی اور شہرت یہی تھی کہ سندھ یونی ورسٹی (شعبۂ اردو) کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے جسے کسی وجہ سے کہیں داخلہ نہ ملے وہ اس شعبے میں داخلہ لے لیتا۔ وہ ایک شفیق استاد بھی تھے۔ وہ طلبہ کی راہنمائی کرتے اور تربیت بھی۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ اتنا دلچسپ ہوتا کہ ہر طالب علم کی خواہش ہوتی کہ ان کا پیریڈ چھوٹ نہ جائے۔ حالاں کہ ان کی طرف سے طالب علموں پر کلاس لینے کی کوئی سختی نہ تھی۔ پورے شعبے کے طالب علم ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے اور علم حاصل کرتے۔ طالب علم سے اگر کوئی غلطی بھی ہو جاتی تو اسے سرزنش کرنے کے بجائے، کلاس لینے کے دوران نہایت محبت سے باتوں ہی باتوں میں اصلاح کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے لیکچر کو دلچسپ واقعات، قرآنی آیات اور احادیث کے علاوہ بزرگانِ دین کے حال احوال سے مزین کر کے اس انداز سے بیان کرتے کہ طالب علم متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ انھیں سگریٹ نوشی سے بہت چڑ تھی، لیکن پھر بھی کچھ طالب علم سگریٹ نوشی کرتے۔ اگر ایسے طلبا کبھی ڈاکٹر صاحب کے پاس کسی کام سے آتے تو وہ منہ تھوڑا سا دوسری طرف پھیر کر ان کی بات سن لیتے۔ اس سے انھیں گمان نہ ہوتا کہ انھوں نے برا مانا ہوگا۔ اکثر ایسے بھی ہوتا کہ اپنے منہ میں الائچی رکھ کر چبانا شروع کر دیتے۔

ڈاکٹر پروفیسر حسن محمد خاں نے اپنے ایک مضمون ''ایک آئیڈیل استاد، ایک بہترین انسان'' میں ایک شاگرد کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ سگریٹ نوشی کرتا اور اکثر کلاس سے غائب رہتا لیکن اس کی کلاس میں آمد کا پتا سگریٹ کی بو سے چلتا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے باقی کلاس کے ساتھ ساتھ اس سے بھی ایک شعر پڑھوایا تاکہ معنی اور تشریح پر تفصیل سے گفتگو ہو سکے۔ اس نے شعر پڑھا تو ڈاکٹر صاحب نے پھر کہا کہ اس شعر کو دہراؤ۔ شاگرد نے بے خیالی میں پھر شعر پڑھا۔ شعر کا پہلا مصرع ہے ''کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں'' ڈاکٹر صاحب بے اختیار ہنسنے لگے کیوں کہ اس نے ''پنپنے'' کو ''پن پنے'' پڑھ دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں یہ کہتے ہوئے ٹوکا کہ کیا ''مِن مِنا'' رہے ہو۔ یہ لفظ ''پنپنا'' بروزن ''تڑپنا''، ''جھپٹنا'' وغیرہ ہے۔ اس کے بعد وہ شاگرد کبھی کلاس میں نہ آیا لیکن جب نتیجہ کا اعلان ہوا تو وہی طالب علم اول پوزیشن پر آیا، جس کے بعد تمام طالب علم دل سے ڈاکٹر صاحب کی فراخ دلی، عفو و درگزر، منصفی اور وسیع القلبی کے قائل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس نہ صرف ان کے شعبے کے طلبا موجود رہتے بلکہ دوسرے شعبوں کے طالب علم بھی اپنے اپنے مسائل لے کر آتے رہتے۔

وہ نہایت توجہ سے ان کے مسائل سنتے اور حتی الامکان ان کی مدد بھی کرتے۔ وہ ایک تنگ نظر مذہبی شخص نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے طلبا کو غیر نصابی سرگرمیوں سے منع نہیں کیا۔ طالب علموں کی ایک کثیر تعداد اس لیے بھی شعبہ اردو (سندھ یونی ورسٹی) میں آتی کہ وہاں طالبات زیادہ تھیں اور آئے دن سیر اور پکنک کا پروگرام بنتا رہتا۔ جب پکنک ہوتی تو طالب علم ٹرانسسٹر بھی ساتھ لے جاتے، ایک منچلا طالب علم ڈانس کرنا شروع کر دیتا۔ باقی طلبا اس کو گھیرے میں لے لیتے تاکہ ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہ ہو سکے۔ طالب علم بھی اسی خوش فہمی میں رہا کہ انھیں نہیں معلوم۔ ایک دن وہ کلاس سے غیر حاضر تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب کلاس میں آئے۔ انھوں نے فوراً اس کی غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے شعبہ کا ناچنے والا کہاں ہیں۔ پکنک میں عام طور پر وہ شعبہ اسلامیات کے بزرگ اساتذہ کے ساتھ علمی و ادبی گفتگو میں مصروف ہو جاتے اور طلبا اپنی اپنی

سرگرمیوں میں مصروف ہوجاتے لیکن جیسے ہی نماز کا وقت ہوتا۔ اذان دی جاتی اور تمام لوگ باقاعدگی سے باجماعت نماز ادا کرتے۔ وہ درحقیقت اپنی ذات میں انجمن تھے اور کشف وکرامات کے مالک تھے۔ وہ دورِحاضر کے ایسے ولی تھے، جنھوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ آج بھی فرمانِ الٰہی اور سنت رسول ﷺ کی پیروی کرنا دشوار اور مشکل کام نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے باقاعدہ دنیاوی زندگی گزاری لیکن پھر وہ اس کی جملہ آلائشوں سے پاک رہے اور نہ ہی خود کو اس کی رونقوں میں گم ہونے دیا۔ بلکہ ہر طرح کے حالات میں خدا اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ سے لو لگائے رکھی۔ اسی لیے ان کا فیض امیر وغریب پر یکساں رہا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا انتقال ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء کو سندھ یونی ورسٹی (حیدر آباد) کے اولڈ کیمپس میں واقع رہائش گاہ پر ہوا۔ اسی دن ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ انھیں حیدر آباد بائی پاس کے قریب تعلیماتی مرکز المصطفیٰ ٹرسٹ کی جامع مسجد غفوریہ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی چند ایک باتیں یہاں درج کی جارہی ہیں، جو خاص طور پر استاد اور شاگرد کے حوالے سے اقوال کا درجہ رکھتی ہیں:

۱۔ اپنے مسلک کو نہ چھوڑو اور دوسروں کے مسلک کو نہ چھیڑو۔

۲۔ اگر استاد بہترین ہو تو وہ نصاب بھی بہترین بنادے گا۔

۳۔ وہ استاد ہی نہیں، جو اپنے شاگردوں کو بیٹا نہ سمجھے اور وہ استاد ہی نہیں جو شاگردوں سے اپنا ادب نہ کرا سکے۔

۴۔ دراصل شاگرد خود اپنے استاد کا ادب نہیں کرتا بلکہ استاد خود اپنا ادب کرواتا ہے۔

۵۔ مدرسوں میں اساتذہ اپنے شاگردوں کی خوب پٹائی کرتے ہیں اس لیے کہ خود بھی خوب پٹے ہوتے ہیں۔ اسی لیے بدلہ تو کہیں نہ کہیں اتارنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں جن وظائف کی اجازت دی ان کو یہاں درج کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے چند ایک طبی نسخے ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ کاروبار میں ترقی یا بے روزگار شخص فجر کی نماز کے بعد ایک سو مرتبہ **سبحان اللہ**

وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم پڑھ کر دعا کرے۔

۲۔ حافظہ بہتر بنانے کے لیے زعفران کی چار پانچ بالیاں تھوڑی سی شکر میں رکھ کر کھلا دیں۔(یہ نسخہ ڈاکٹر صاحب کے نانا نے انھیں خواب میں بتایا)

۳۔ مرگی والے مریض پر سورہ مزمل پڑھ کر دم کریں آرام آجائے گا۔

۴۔ مقدمہ میں **لاحول ولاقوۃ الاباللہ،** ۵۰۰ مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔

۵۔ جو بچہ بستر پر پیشاب کر دیتا ہو اسے رات سوتے وقت سات دانے پستے کے کھلا دیں۔

۶۔ شادی نہ ہونے کی صورت میں ''یا لطیف'' ۵۰۰ مرتبہ پڑھیں۔

۷۔ ہچکی روکنے کے لیے گڑ کھلائیں اور پیچش میں شکر قندی (یہ نسخہ بھی ڈاکٹر صاحب کے دادا نے خواب میں بتایا)۔

۸۔ میاں بیوی کے درمیان محبّ والفت پیدا کرنے کے لیے صبح وشام ایک سو مرتبہ **والقیت علیک محبتہ منی** پارہ نمبر ۱۶ آیت ۱۲ پڑھ کر دم کریں۔

۹۔ بے اولاد سورۃ مریم کی آیت ۱۲ ایک سو مرتبہ پڑھیں۔

۱۰۔ نافرمان بچے کی وجہ سے اگر والدین پریشان ہوں تو **لاحول ولاقوۃ الا باللہ** پڑھ کر شکر پر دم کر کے کھلا دیں یا سوتے وقت اس کے دونوں کانوں میں اذان دے دیں۔

۱۱۔ اگر بچہ اغوا یا کسی وجہ سے گم ہو جائے تو **یا حیی یا قیوم برحمتک استغیث** پڑھتے رہیں۔

۱۲۔ سانپ کا زہر دور کرنے کے لیے پانی میں ہلدی گھول کر فوراً پی لیں یہ عمل تین مرتبہ کریں یا تھوڑا کاٹ کر آکڑے کا دودھ ٹپکائیں تھوڑی دیر میں سارا زہر باہر آجائے گا۔

۱۳۔ ایسا مریض جس کا پیشاب بند ہو گیا اس کی ناف میں بھینس کے کان کا میل بھگو کر رکھ دیں۔

۱۴۔ بچھو کے کاٹنے کی صورت میں گاڑھے نمک کا لیپ اس جگہ پر کر دیں۔

۱۵۔ کتا کاٹ لے تو فوراً لہسن پیس کر پٹی باندھ دیں۔ تکلیف بہت ہوگی اور پک بھی جائے گا لیکن زہر تمام ختم ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں اگر پاگل کتا کاٹ لے تو چند ایک آکڑے کے پتے پیس کر کھلا دیں۔ تھوڑی دیر میں قے اور دست ہو کر سارا زہر نکل جائے گا۔

۱۶۔ السر میں مبتلا مریض کو دو چمچ شہد اور دو چمچ زیتون کا تیل ایک کپ گرم دودھ میں ڈال کر رات کو پلائیں، پندرہ بیس دن میں افاقہ ہو جائے گا۔

۱۷۔ گردے میں پتھری ہونے کی صورت میں آدھا کلو زیتون کا تیل لے کر پانچ لیموں نچوڑ لیں اور اسے ایک دن میں ختم کریں۔ پتھری نکل جائے گی۔

۱۸۔ بچہ کہانہ مانے تو درود پاک سو مرتبہ پڑھ کر اس کے کان میں پھونک دیں۔

۱۹۔ خربوزے کے چھلکے کھانے سے پتھری نکل جاتی ہے۔

۲۰۔ یرقان کے مریض کو ایک مولی کا عرق شہد میں ملا کر روزانہ دو مرتبہ پلائیں ایک ہفتے میں افاقہ ہو جائے گا۔

(ح) فہرست تصنیفات، تالیفات اور تراجم

۱۔ ''سید حسن غزنوی'' (مقالہ پی۔ایچ ڈی)

۲۔ تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی) ۱۹۵۵ میں لاہور سے شائع ہوئی۔

۳۔ چند فارسی شعراء، دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ پہلا ایڈیشن سید حسن غزنی اور ان کے معاصرین کے متعلق تھا۔ اضافوں کے ساتھ ۱۹۸۹ء میں نیا ایڈیشن آیا۔

۴۔ ''فارسی پر اردو کا اثر'' ۱۹۵۲ء (پہلا ایڈیشن) اور ۱۹۶۱ء میں دوسری بار اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں فارسی کی کتابوں سے اردو کے الفاظ کے استعمال کا ذکر ملتا ہے۔

۵۔ ''مکتوبات شاہ احمد سعید دہلوی'' (فارسی مکتوبات) ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔

۶۔ ''ارشاد رحیمہ'' (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد کی تصنیف مع اردو ترجمہ) ۱۹۵۲ء میں طبع ہوئی۔

۷۔ ''ہدایت الطالبین'' (شاہ ابوسعید دہلوی کی تصنیف مع اردو ترجمہ) ۱۹۵۶ء (پہلا ایڈیشن) اور ۱۹۶۶ء (دوسرا ایڈیشن) میں شائع ہوئی۔

۸۔ ''حالی کا ذہنی ارتقا'' ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی، سندھ یونی ورسٹی (ایم اے اردو) کے نصاب میں شامل ہے۔

۹۔ علمی نقوش (تحقیقی مقالات) ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ ''فارسی پر اردو کا اثر'' اور حالی کا ذہنی ارتقا ان تینوں کتابوں پر انھیں ناگ پور یونی ورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی۔

۱۰۔ ''رسائل مشاہیر نقشبندیہ'' (نایاب رسائل) ۱۹۵۸ میں شائع ہوئے۔

۱۱۔ ''ملفوظات اکابر نقشبندیہ'' ۱۹۵۹ میں شائع ہوئے۔

۱۲۔ ''ادبی جائزے'' (ادبی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۵۹ء میں طبع ہوئے۔

۱۳۔ ''دیوان روشن سرہندی'' (فارسی) ۱۹۶۱ میں شائع ہوا۔

۱۴۔ ''تفسیر مولانا عبیداللہ سندھی'' (صرف آخری پارہ) ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

۱۵۔ ''سندھی اردو لغت'' (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی معاونت سے) ۱۹۶۰ء میں مرتب ہوئی۔

۱۶۔ ''اردو سندھی لغت'' (معاون ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) ۱۹۶۰ء میں مرتب ہوئی۔

۱۷۔ ''انتخابات مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی'' (اردو ترجمہ) ۱۹۶۳ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔

۱۸۔ ''سوانح امیر کلاں بخاریؒ '' (نایاب کتاب) ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی۔

۱۹۔ ''تحریر و تقریر'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

۲۰۔ ''دیوان عظیم تتوی'' (فارسی) سندھی ادبی بورڈ ۱۹۶۲ میں شائع ہوا۔

۲۱۔ ''ترجمہ قرآن مجید'' (مخدوم نوح ہالائی کے فارسی ترجمے کا پہلا پارہ) ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

۲۲۔ ''اثبات النبوۃ'' (حضرت مجدد الف ثانی کے عربی رسالے کا مختلف قلمی نسخوں کے تقابل سے) ۱۹۶۳ء میں طبع ہوا۔

۲۳۔ ''مکتوبات شاہ محمد نقشبندی سرہندیؒ '' ۱۹۶۳ میں شائع ہوئی۔

۲۴۔ ''رسالہ تہلیلیہ'' (حضرت مجدد الف ثانی عربی رسالہ) ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

۲۵۔ ''ردروافض'' (حضرت مجددالف ثانی فارسی رسالہ) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

۲۶۔ ''مکاشفات غیبیہ'' (حضرت مجدد الف ثانی کا فارسی رسالہ ملفوظات ومکاشفات) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

۲۷۔ ''مجددالف ثانی'' (تحقیقی جائزہ۔ایک معترض کے جواب میں) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

۲۸۔ ''ضیاالقرأت'' (قاری ضیاءالدین احمدالہ آبادکی نایاب کتاب) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔

۲۹۔ ''سعیدالبیان'' (حضور صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے متعلق شاہ احمد سعید دہلی کی کتاب) ۱۹۶۵ء میں طبع ہوئی۔

۳۰۔ ''مجمع البحرین'' (ملاپایندہ محمد کانایاب ونادررسالہ) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

۳۱۔ ''تاریخ اسلاف'' (خاندانی حالات،پس منظراورذاتی مشاہدات) ۱۹۵۶ میں شائع ہوا۔

۳۲۔ ''مکتوبات خواجہ عبدالاحدسرہندی'' (نایاب ونادرمجموعہ) ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

۳۳۔ ''مسائل اربعین'' (شاہ احمد سعید دہلوی کی مختلف مسائل پرمشتمل بحث) ۱۹۶۶ء۔

۳۴۔ ''قرآن عربی'' (عربی صرف ونحو پرآسان کتاب) پہلی مرتبہ ۱۹۶۶ء دوسری مرتبہ ۱۹۷۲ء اور تیسری مرتبہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔

۳۵۔ ''مکتوبات خواجہ سیف الدین سرہندی'' (حضرت مجدد کے آخری ایام خواجہ بدرالدین سرہندی کااہم فارسی رسالہ) ۱۹۴۸ء۔

۳۶۔ ''مکتوبات خواجہ سیف الدین سرہندیؒ'' (نایاب ونادرمجموعہ) ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئے۔

۳۷۔ ''تحقیقی جائزے'' (تحقیقی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔

۳۸۔ ''رسالہ ملوک'' (میر محمد نعمان کانایاب رسالہ) ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

۳۹۔ ''جامع القواعد'' (حصہ نو معاون ڈاکٹر نجم الاسلام) ۱۹۷۲ء میں طبع ہوا۔

۴۰۔ ''برصغیر میں فارسی ادب'' (انگریزی) ۱۹۷۲ء۔

۴۱۔ ''مکتوبات حضرت مجددالف ثانیؒ'' (نایاب مکتوبات) ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئے۔

۴۲۔ ''مکتوبات خواجہ محمد عبیداللہ سرہندیؒ''۱۹۷۴ء۔

۴۳۔ ''مکتوبات ریاست دیر''(حضرت مظہر جاں جاناں اور ان کے سلسلے والوں کے نایاب ونادر مکتوبات) معاون ڈاکٹر نجم الاسلام ۱۹۷۵ء میں منصۂ شہود پر آیا۔

۴۴۔ ''ندائے سحر''(ریڈیائی تقریریں)۱۹۷۶ میں منظر عام پر آئی۔

۴۵۔ ''مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی''۱۹۷۶ء میں شائع ہوئے۔

۴۶۔ ''سبیل الرشاد''(خواجہ عبدالاحد سرہندی کا نایاب رسالہ)۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔

۴۷۔ ''اقبال اور قرآن''اقبال اکیڈمی لاہور نے ۱۹۷۸ء میں شائع کی۔

۴۸۔ ''معارف اقبال''(مضامین) پہلی بار ۱۹۷۸ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔

۴۹۔ ''تفسیر شیخ الہند''(مولانا محمود حسن کے پہلے دو پاروں کا انگریزی ترجمہ)۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۵۰۔ ''اردو میں قرآن وحدیث کے محاورات''(ایک جائزہ) ادارہ تحقیقات اسلامی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کی۔

۵۱۔ ''مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل''

۵۲۔ ''حضرات القدس''(خواجہ بدرالدین سرہندی کی اہم تصنیف)۱۹۸۲ء۔

۵۳۔ ''مطالب القرآن''(قرآن کا خلاصہ)۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔

۵۴۔ ''ہمہ قرآن در شان محمد''۱۹۸۳ء۔

۵۵۔ ''زبدۃ المقامات''(خواجہ محمد ہاشم کشمی کی اہم تصنیف)۱۹۸۷ء۔

۵۶۔ ''ہمارا علم وادب''(تحقیقی کتاب) ترجمہ وحواشی ۱۹۸۵ء۔

۵۷۔ ''ثقافتی اردو''(طویل مضمون)۱۹۶۱ء۔۱۹۸۹ء۔

۵۸۔ ''وقائع تاریخی''(قطعات تاریخی کا مجموعہ) ۱۹۸۸ء۔

۵۹۔ ''باقیات باقی''(حضرت خواجہ باقی باللہ سے متعلق تحقیقی کتاب)۔

۶۰۔ Studies in Literature(انگریزی میں ۱۳ تحقیقی مضامین)۱۹۹۵ء۔

۶۱۔ ''ہفت محفل'' مضامین ۱۹۹۲ء۔

۶۲۔ ''عارف نامہ'' ۱۹۹۳ء۔

۶۳۔ ''طوبیٰ لھم'' (خاندانی واقعات) ۱۹۹۳ء۔

۶۴۔ ''میرا علی گڑھ'' (یادداشتیں اور مضامین) ۱۹۹۵ء۔

۶۶۔ ''انعمت علیھم'' (مضامین سات شخصیات پر) ۱۹۹۷ء۔

۶۷۔ ''سفر نامے'' ڈاکٹر سراج احمد خاں اور ڈاکٹر منیر احمد خان کے سفر نامے بھی اس میں شامل ہیں) ۱۹۹۷ء۔

۶۸۔ (الف) ''علامہ جلال الدین سیوطی اور علم نعت'' (رسالہ اردو نامہ) ۱۹۹۲ء۔

۶۹۔ (ب) ''مسائل اللحیہ''۔

۷۰۔ (ج) ''حکم اللحوم المتقوردہ''

۷۱۔ (د) ''تنبیھات علی ان جدہ لست میقاتا''

۷۲۔ (ہ) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (علامہ ابن تیمیہ)

۷۳۔ ''سراج البیان'' ۱۹۹۶ء۔

طویل مقالات

(الف) ''بابائے اردو کی اردو'' (رسالہ اردو: کراچی)

(ب) ''عبدالعزیز خالد کی شاعری'' (رسالہ سیارہ: لاہور) ۱۹۶۵ء

چھوٹے رسالے

۱۔ ''مذہبی رواداری'' (تعلیم بالغاں کے لیے) جامعہ ملی، ملیر، کراچی۔

۲۔ ''سراج منیر'' صدیقی ٹرسٹ کراچی ۱۹۸۱ء۔

۳۔ ''قرآن و حدیث کے بدایع و منابع'' کراچی ۱۹۸۱ء۔

۴۔ ''ابواب متفرقہ'' (تحقیقی مضامین، اخباری خبریں اور یادداشتیں) ۱۹۹۸ء۔

۵۔ ''مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں'' (خطوط) ۱۹۹۷ء۔
۶۔ ''اوراق گم گشتہ (۳۷ تحقیقی وادبی مضامین) ۱۹۹۷ء۔
۷۔ ''یادگار خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں'' (مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ) ۱۹۹۸ء۔
۸۔ ''لنا اعمالنا'' (سوانحی حصہ) ۱۹۹۸ء۔

ڈاکٹر صاحب کے مقالات پنجاب یونی ورسٹی اور تہران کے انسائیکلو پیڈیا میں شامل ہیں جو متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

زیرترتیب کتابیں

۱۔ مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (حصہ دوم)۔
۲۔ یادگار خطوط بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (حصہ دوم)۔
۳۔ مطبوعہ تحقیقی مضامین (دوسرا مجموعہ)
۴۔ تقریروں کا مجموعہ
۵۔ غیر مدون تبصرے

(ط) اعزازات

۱۔ ۱۹۸۰ء میں اردو میں قرآن وحدیث کے محاورات کے موضوع پر فکر ونظر (اسلام آباد) سے بیس ہزار روپے دیے گئے۔
۲۔ ۱۹۸۲ء میں ''حضرات القدس کا اردو ترجمہ'' (دس ہزار روپے)۔
۳۔ ۱۹۸۳ میں ''ہمہ قرآن درشانِ محمدؐ'' پر نقوش ایوارڈ (دس ہزار روپے) دیا گیا۔
۴۔ ۱۹۸۳ء میں اقبال ایوارڈ (پچیس ہزار روپے) دیا گیا۔
۵۔ ۱۹۸۵ء میں ''اقبال اور قرآن'' ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۱ء تک، اقبال پر بہترین کتاب ہونے پر صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔
۶۔ ۱۹۸۸ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے نشان سپاس دیا گیا۔
۷۔ ۱۹۹۲ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز دیا گیا۔
۹۔ ۱۹۹۰ء میں ۵۰ سالہ علمی وادبی خدمات پر انھوں نے سندھ یونی ورسٹی کی طرف سے طلائی تمغہ حاصل کیا۔

حوالہ جات

۱۔ مسرور احمد زئی، مشمولہ سہ ماہی نئی عبارت......شمارہ ۱۲۔۱۳، جلد ۴، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء۔
۲۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، انعمت علیھم ص ۵۰۔
۳۔ مسرور احمد زئی، مواطنِ کثیرہ، انوارِ ادب، حیدرآباد، ۲۰۰۰، ص ۲۹۔
۴۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، ص ۱۲۳، ۱۲۴۔
۵۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، میر اعلیٰ گڑھ، ۱۹۹۳، ص ۱۰۔
۶۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی و ادبی خدمات، ص ۵۲۔
۷۔ مسرور احمد زئی، نئی عبارت، ص ۴۲، ۴۳۔
۸۔ علامہ آئی آئی قاضی، مشمولہ نئی عبارت......ص ۱۸۷۔
۹۔ مسرور احمد زئی، مشمولہ نئی عبارت............ص ۵۱۔
۱۰۔ عفت بانو، تحقیق رسالہ، شمارہ ۶، ص ۱۵۔
۱۱۔ سراج احمد خاں، ڈاکٹر، مشمولہ نئی عبارت، ص ۱۰۔
۱۲۔ سراج احمد خاں، ڈاکٹر، مشمولہ نئی عبارت، ص ۱۰۷۔
۱۳۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، حالات و علمی و ادبی خدمات، ص ۱۶۷۔
۱۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، مشمولہ نئی عبارت، ص ۸۲۔
۱۵۔ موسیٰ بھٹو، نئی عبارت، ص ۱۰۸۔
۱۶۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، لنا اعمالنا، اے آر پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، ص ۱۲۔
۱۷۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، نئی عبارت، ص ۱۰۸۔
۱۸۔ سراج احمد خاں، ڈاکٹر، نئی عبارت، ص ۱۰۶۔
۱۹۔ موسیٰ بھٹو، نئی عبارت، ص ۱۱۰۔

باب دوم

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی وادبی خدمات

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں جیسی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، ویسی ہی رنگا رنگی ان کے تصنیفی وتالیفی کام میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ مختلف حیثیات سے اردو دان طبقے میں جانے پہنچانے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب معلم بھی تھے، ادیب بھی، محقق بھی، تاریخ گو، ناقد اور اقبال شناس بھی۔ قرآن فہمی ایک خاص خوبی تھی، جو ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ دینی اور روحانی طور پر جواں مرد مسلمان تھے اور راہِ سلوک کی بیشتر منزلوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی، جس کی وجہ سے انھوں نے تمام عمر بے شمار علمی وادبی خدمات انجام دیں۔ تمام زندگی اردو اور علم کی ترویج واشاعت میں گزاری دی۔ ان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے ہوتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ابھی وہ علی گڑھ میں پڑھ رہے تھے جب ان کی انگریزی میں پانچ کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ وہ کتابیں ان کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہیں۔ اسی زمانے میں حضور ﷺ پر ایک کتاب اور چار کتابیں خلفائے راشدین ؓ پر تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ انہی دنوں نیویارک (امریکہ) میں ایک مقابلہ ''World Competition'' کے نام سے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے "How can youth contribute to the realization of a universal religion?" کے موضوع پر فارسی میں مضمون لکھا اور اس عالمی مقابلے میں بھیجا۔ اس مضمون کو ان کے اساتذہ نے بھی بے حد پسند کیا اور وہاں بھی اسے پذیرائی ملی، جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔

درحقیقت یہیں سے ان کی علمی وادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلوب ہر شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر صاحب کا اسلوب بھی ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ جس میں سادگی اور دلکشی ہے۔ انداز بیاں سلیس اور رواں ہے۔ ژولیدگی اور ابہام کا نشان نہیں ملتا۔ زبان ایسی سہل کہ آسانی سے ہر ایک کو سمجھ میں آجائے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر سقم سے پاک نظر آتی ہے۔ وہ تشبیہات واستعارات کی بھرمار کے بجائے سیدھے اور سادہ الفاظ میں معلومات فراہم کردینے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تحریر شگفتہ، واضح، مؤثر اور سلجھی ہوئی ہے۔ پڑھتے ہوئے قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ عبادت وریاضت میں مستغرق نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی تحریر میں فلسفیانہ ومناظرانہ رنگ غالب نہیں۔ انھوں نے تمام زندگی علمی وادبی کاموں پر توجہ مرکوز رکھی۔ عام طور پر مصنفین خود کو کسی ایک دائرے میں مقید کرلیتے ہیں اور تمام عمر ان سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتے یا پھر وہ نکل نہیں سکتے کیوں کہ ان کی ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت ہوجاتی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کسی ایک دائرے میں نظر نہیں آتے۔ وہ ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں کامیابی سے داخل ہوجاتے ہیں اور یہی ہنر انھیں دوسروں سے ممتاز بھی کرتا ہے۔ ان کی پہچان اور شہرت کسی ایک حیثیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی کئی حیثیات ہیں جن کو احاطہ تحریر میں لانا ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ضرور ہے۔ یہاں پر ڈاکٹر صاحب کی حسب ذیل حیثیات اور علمی ادبی خدمات کو زیر بحث لایا جائے گا۔

۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت محقق
۲۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت نقاد
۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت ماہر لسانیات
۴۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت لغت نویس
۵۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت اقبال شناس
۶۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت مقدمہ نگار

۷۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت خطوط نگار
۸۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت تاریخ گو
۹۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی خدمات (سلسلہ نقشبندیہ کے حوالے سے)
۱۰۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور اردو نصاب کی تدوین
۱۱۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور فارسی زبان و ادب
۱۲۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی قرآن شناسی

ذیل میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی مذکورہ بالا حیثیات کو زیر بحث لایا جائے گا۔

(الف) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت محقق

ڈاکٹر صاحب اعلیٰ پایہ کے محقق تھے اور ایک محقق ہونے کی حیثیت سے انھیں اپنی ذمہ داریوں کا بہ خوبی احساس تھا۔ وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھے، جو ایک محقق میں ہونا لازمی ہیں۔ کیوں کہ ان اوصاف کے بغیر ایک محقق اپنی ذمہ داریوں کو بہ احسن پورا نہیں کر سکتا اور نہ ہی تحقیق کا حق ادا کر سکتا ہے۔ محقق میں مختلف اعلیٰ ذہن بیک وقت جمع ہوتے ہیں۔ وہ نقاد بھی ہوتا ہے اور ماہر لسانیات بھی۔ وہ اپنی ذاتی پسند ناپسند سے بالاتر ہو کر کام کرتا ہے۔ ان اخلاقی اور کرداری اوصاف کے لیے اسے خاص ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کی ذہنی تربیت کا سامان ان کے گھر کے ماحول نے فراہم کیا۔ تحقیق بہت سی باتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ تحقیق کے متعلق ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں:

> ''اس میں انتہائی دیانت داری، خلوص، ایثار، خود فراموشی، نفس وجذبہ کشی
> ، خاکساری درکار ہے اور یہ خوبیاں اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتیں جب
> تک ان کی تربیت بڑے اعلیٰ پیمانے پر نہ کی گئی ہو۔''(۱)

ڈاکٹر صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی پر مکمل دسترس تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات میں توازن اور اعتدال موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے

کسی بھی تحقیقی کام کو اٹھا کر دیکھ لیں اس میں عجلت پسندی نظر آتی اور جہاں تک ہو سکا انھوں نے غیر جانب داری سے اپنی محققانہ آراء قائم کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے نہایت تحمل اور وقار کے ساتھ تحقیقی کام انجام دیا۔ بحیثیت محقق انھوں نے فن تحقیق، صرف ونحو، اردو املا کی تاریخ، فارسی اور عربی سے تراجم، فارسی شعر وادب کی تاریخ اور انگریزی تاریخی وتحقیقی کتب، قرآن پاک مع مکمل تفسیر، اقبال اور قرآن کے صنائع بدائع اور قرآنی محاوارت کو موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اسی لیے کثیر التصانیف، کثیر الجہات اور کثیر الاوصاف کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور انگریزی کے اہم موضوعات سے اردو دان طبقے کو روشناس کرایا۔ یہاں تک کہ بعض ایسے پہلو بھی ان کی تحقیقی کاوش سے سامنے آئے، جن سے اس سے پہلے اردو دان طبقہ واقفیت نہیں رکھتا تھا یا اگر معلومات تھیں بھی تو ناقص۔ مثال کے طور پر عمادی غزنوی اور عمادی شہر یاری کو ایک مدت تک دو الگ الگ شاعر تصور کیا جاتا رہا۔ حالاں کہ ان کے استاد ہادی حسن (علی گڑھ) سے بھی یہ غلطی ہوئی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے اپنے استاد محترم سے اختلاف کیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ یہ ایک ہی شاعر کے دو نام ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے معیاری تحقیق کے جو اصول مقرر کیے۔ ان پر سختی سے خود بھی کاربند رہے۔ کیوں کہ اصول بنا لینا بہت آسان ہے مگر ان پر عمل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب تحقیق کے لیے زبان کے عبور پر زور دیتے تھے۔ یعنی محقق کو اپنے دائرہ کار میں کثیر المعلومات اور کثیر المطالعہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ محقق کا مطالعہ کسی مقام پر رکنا نہیں چاہیے۔ اگر اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تحقیقی کام کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں یہی اصول کارفرما آتا ہے۔ ان کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی کہ تحقیقی نتائج سے انحراف کی گنجائش نہ رہے لیکن جہاں کہیں ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ جاتا (جب ابھی شک وشبہ موجود ہوتا) تو ایسی صورت میں کئی مقالات میں یہ جملہ لکھا ہوا ملتا کہ ''محض میرا گمان ہے'' مثال کے طور پر ''مکاشفات عینیہ'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے اسی نقطۂ نظر کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی

تحقیق کی اہم خصوصیت انتہا پسندی سے پاک ہونا ہےاور وہ اعتدال کے اس راستے کی طرف لے جاتے ہیں جہاں سچائی اور حق کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔

تحقیق میں پرعزم ہونا بہت ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر محقق حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ بعض اوقات اس کی برسوں کی محنت ضائع یا اکارت ہو جاتی ہے اور اسے ہر لمحہ نئے تجربات سے واسطہ پڑھتا ہے۔ تحقیق کبھی رکتی نہیں اور کسی بھی وقت کوئی نئی بات یا نکتہ سامنے آ سکتا ہے، جو پہلے کی تحقیق کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔

حسن غزنوی پر تحقیق کرتے ہوئے ایسے دشوار گزار مراحل آئے کہ ڈاکٹر صاحب کی ہمت جواب دے گئی لیکن پھر بھی حوصلے اور ہمت کے ساتھ انھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسی طرح ''فارسی پر اردو کا اثر'' ان کی مختصر سی کتاب ہے لیکن اپنے موضوع کے حوالے سے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ''اقبال اور قرآن'' اگر چہ ایک ضخیم کتاب ہے، جسے انھوں نے چند مہینوں میں مکمل کر لیا۔ اس سے ان کی محنت، لگن اور حوصلہ کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس دقتِ نظر سے انھوں نے اسے ایک قلیل مدت میں مکمل کیا۔ یہ تحقیقی کاوش چند مہینوں پر مشتمل ہے۔ گیاں چند کے مطابق:

> ''یہ طویل اور ہمہ گیر نوعیت کا کام اگر چہ بہت کم وقت میں مکمل ہوا لیکن آپ کے بعض کام ایسے بھی ہیں، جس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے کیوں کہ یہی موضوع کا تقاضا تھا۔ مآخذ تک رسائی وغیرہ میں اتنا وقت ضروری تھا اور یہ بھی عظمت میں استحکام کی علامت ہے۔''[۲]

ان کے ہاں توازن اور اعتدال کی کیفیت ہر معاملے میں ملتی ہے۔ وہ کبھی کسی گروہی، ادبی اور لسانی جھگڑے میں نہیں پڑے۔ صوفیانہ خیالات میں توازن رکھا، دیو بندی یا بریلوی نظریات کو کبھی نہیں چھیڑا۔ دیو بندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کی خدمت بھی کرتے رہے اور احمد رضا خاں بریلوی کا بھی احترام کرتے رہے۔ ان پر ایک نہایت جامع مضمون قلم بند کیا۔

محقق کبھی بھی عجلت پسند نہیں ہوتا اور نہ ہی تساہل کا قائل ہوسکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا جائے تو ان کی نہایت عمدہ تحقیقی کاوشیں اسی خوبی کی مرہون منت ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۰ء میں امراؤتی کالج میں خطبۂ صدارت دیا اور اس میں اردو کے حوالے سے بحث کی۔ ۱۹۵۰ء میں اس خطبے کا بیش تر حصہ ''اردو املا کی تاریخ'' کے موضوع پر معارف علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مسلسل اس موضوع پر کام کرتے رہے۔ اسی طرح انھوں نے تحقیق میں غیر جانب دارانہ رویہ برقرار رکھا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کرتے ہوئے شاعر پر تحقیق کے دوران ایسے قصائد بھی سامنے لے کر آئے جن میں چند ایک تبدیلیاں کر کے شاعر نے کسی اور ممدوح کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے صاف الفاظ میں لکھا کہ شاعر روزی روٹی کے لیے ایسا کرتا ہے۔ پھر انھوں نے ایسے قصائد کی طرف بھی اشارہ کیا جو شاعر نے مسعود سعد سلمان کی پیروی میں لکھے۔ وہ غیر جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے سعد سلمان کے قصائد کو ان کے مقابلے میں زیادہ اہمیت بھی دی اور لائق تحسین ٹھہرایا۔

ڈاکٹر صاحب نے تحقیقی میدان میں ہر سطح پر تحمل اور بردباری کا رویہ اپنایا۔ اگر کوئی ان کی تحقیقی کاوش سے اختلاف کرتا تو وہ اسے وسیع القلبی سے قبول کرتے۔ اس کی مثال اس سے لی جاسکتی ہے کہ محمد اکرام چغتائی کا مضمون ''ولی گجراتی کا نام'' کے عنوان سے ''اردو نامہ'' (کراچی) میں ستمبر ۱۹۶۶ میں شائع ہوا۔ انھوں نے مدیر ''اردو نامہ'' شان الحق حقی کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں ایک مضمون (ساقی: فروری ۱۹۵۴ء) کا ذکر کرتے ہوئے ولی ہی کے کلیات سے حوالہ دیا اور یوں درج کیا:

؎ بعد شاہ نجفؓ ولی اللہ
پیر کامل علی رضا پایا

عندلیب شادانی نے رسالہ ''اردو نامہ'' کے شمارہ ۲۹ (۱۹۶۷ء) صفحہ نمبر ۱۴۲ میں ڈاکٹر صاحب کے اس خط کا جواب دیا کہ اس شعر میں ولی اللہ نام نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس شعر کے

بعد مقطع بھی ہے۔ انھوں نے خط میں مزید لکھا کہ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش موجود نہیں ہے کہ بعض اوقات شاعر تخلص کے بجائے اپنا پورا نام بھی مقطع میں لے آتا ہے لیکن تخلص کے بجائے پورے نام کا استعمال مقطع ہی میں کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے محققانہ شان اور وقار کو برقرار رکھتے ہوئے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا اور اسی رسالے کے شمارہ ۳۰ میں اس کا جواب فراہم کیا۔ جس میں مستند اور متنوع دلائل بھی پیش کیے۔ انھوں نے اس حوالے سے عندلیب شادانی کی توجہ اس جانب دلائی کہ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس بات کے خلاف جاتے ہیں کہ شاعر کا نام صرف مقطع میں آتا ہے اور مقطع کے علاوہ کہیں نہیں آ سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے محمد قلی قطب شاہ اور انشا کے شعروں کو حوالے کے طور پر پیش کیا مثلاً محمد قلی قطب شاہ کا شعر ہے:

ے محمد ہور علی کا ہے محمد قطب شاہ داسا
کریں سیوا او سے چو پھر پریاں ہم عید و ہم نوروز

اس شعر کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے مزید چار شعر لکھے اور پھر مقطع دیا۔

دعا سو ختم کرونگیں غزل قطب زماں اپ توں
کریں آمیں ملک ہور قدسیاں ہم عید و ہم نوروز

اسی طرح سے انشا کا درج ذیل شعر دیا:

ے میں کیسے نباہتا ہوں تم سے
انشاءاللہ دیکھیے گا
انشا سے آپ اب خفا ہیں
یوں بھر کے نگاہ دیکھیے گا

اس کے بعد مزید دو شعر ہیں اور پھر مقطع ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی حوالے سے چند ایک اور مثالیں بھی دلائل کے ساتھ فراہم کی ہیں اور مزید وضاحت کر دی کہ ان اشعار میں مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی اصول نہیں کہ اگر کسی غزل یا قصیدے یا اشعار میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا

ہےتو دوسرے اشعار میں نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ درج بالا اشعار سے بھی واضح ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ اگر شیعہ حضرات (بقول ڈاکٹر شادانی) حضرت علیؓ کو ولی اللہ کہتے ہیں تو اس سے کسی کو انکار نہیں ؟ اور ولؔی نے اسی لقب کی رعایت سے شاہ نجف کا ذکر کیا ہے۔
بقول ڈاکٹر اسلم فرخی:

> ''شادانی صاحب نے اختلاف رائے کے اظہار میں ایسے الفاظ استعمال کیے جو کسی بزرگ محقق کے شایان شان نہیں تھے۔ڈاکٹر صاحب نے شادانی صاحب کے اعتراض اور نامناسب الفاظ کا جواب جس انکساری سے اور عاجزی سے لکھا، جو لطیف پیرایہ اختیار کیا اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔''(۳)

ڈاکٹر صاحب نے دوسروں کی عزت واحترام کا خیال رکھتے ہوئے مدبرانہ رویہ اختیار کیا۔
بقول ڈاکٹر مسرور احمد زئی:

> ''ڈاکٹر صاحب نے بہ حیثیت محقق اختلاف کرنے والوں کو بھی نہایت تحمل، وقار اور معیار کے ساتھ معترضین کے مقام کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے دلائل انکسارانہ اور محققانہ انداز میں پیش کیے ہیں۔''(۴)

ان کی اس کے متعلق یہ رائے تھی کہ اگر کسی شخص کی کسی معاملے میں اصلاح کی جائے تو اس تحریر کی نقل یا کم از کم اصلاح کیے جانے والے شخص کو اس کی اطلاع ضرور دی جائے۔ مبادا کہ اسے ایک عرصہ کے بعد خود کسی اور ذریعے سے اس اصلاح کی خبر ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس دلیل کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان کی تصنیف ''باقیات باقی'' میں شیخ محمد اکرام کی کتاب'' رودِکوثر'' (تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء مطبوعہ) کے متعلق چند اعتراضات ومعروضات کو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کیوں کہ رودِکوثر کے تیسرے ایڈیشن میں شیخ محمد اکرام نے اکبر فیض اور ابوالفضل کی ''ترک شعائر اسلام'' اور ''مصلحت پسندی'' جیسی ہندوانہ پالیسوں کو سراہا تھا۔اس کے ساتھ انھوں نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ پر کڑی تنقید کی۔لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی معروضات شیخ محمد اکرام کو ارسال کیے لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ دی اور چوتھے ایڈیشن میں مزید

اضافوں کے ساتھ شائع کر دیے۔اس پر ڈاکٹر صاحب نے انھیں مطلع نہ کیا بلکہ بغیر ان کا ذکر کیے حقائق بیان کیے۔اس کا اثر شیخ محمد اکرام پر اس قدر رہا کہ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی محققانہ شان کو تسلیم کرتے ہوئے جناب احمد ربانی کو مشورہ دیا کہ "**کشف والمحجوب**" کا قدیم مخطوطہ جو ان کے پاس موجود تھا تصحیح کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بھیجیں۔ایک طرح سے یہ ان کی عظمت کو تسلیم کرنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی سرگرمیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ انھوں نے تحقیق کو ایک مشغلے کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ تمام زندگی حرز جاں بنائے رکھا۔انھوں نے تحقیقی زبان سادہ رکھی اس کو مشکل نہیں بنایا اور نہ ہی مشکل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔اس لیے ان کا اسلوب سادہ اور رواں ہے کہیں بھی بلا وجہ طوالت اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی نامانوس الفاظ وتراکیب استعمال کیے گئے ہیں۔اس میں سادگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ڈاکٹر صاحب نے تحقیقی میدان میں داخلی شواہد حاصل کرنے کا دشوار گزار راستہ اختیار کیا اور ہمیشہ دلائل کے ساتھ ان حقائق کو پیش کیا۔ان کا مضمون "اسلامی تصوف اور مولانا روم" سادہ نثر کی عمدہ مثال ہے۔

اس کے متعلق ڈاکٹر قاضی عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

> "اس میں کلیدی تصورات کی وضاحت اور اصطلاحات کی تشریح کی طرف خصوصی توجہ نظر آتی ہے۔تحقیقی حوالے بہ وجوہ مختصر اور زبان نہایت سادہ ہے۔"(۵)

ڈاکٹر صاحب منفرد اسلوب کے مالک تھے جو خاص انھیں سے منسوب ہے۔عبدالماجد دریابادی کے مطابق:

> "ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اُردو سیدھی سادی صحیح سلیس اور شستہ لکھتے ہیں، جیسی ہر اس انسان کو لکھنی چاہیے جس کی مادری زبان اردو ہے۔ان کے ذوق سلیم سے تنقیدی مضامین میں تبصرے خصوصاً سلجھے ہوئے، شائستہ اور متوازن ہوتے ہیں، تنقیدی مضامین میں انداز بحث سنجیدہ اور مدلل ہے، متانت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا۔"(۶)

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے زندگی میں تحقیقی میدان کو اگر چنا تو اس میں ان کا مشغلہ نہیں تھا۔ بلکہ ان کا فطری میلان ہی تحقیق کی طرف تھا۔ انھوں نے تحقیقی کام نمود و نمائش یا پذیرائی کے لیے نہیں کیے بلکہ یہ ان کی محققانہ کاوشوں کا ثمر ہے۔ چوں کہ تمام زندگی وہ تحقیق سے وابستہ رہے اس لیے ان کی تحقیق بھی ارتقا کی منازل طے کرتی ہے کیوں کہ تلاش و جستجو کا مادہ ابتدا ہی سے انسان کے اندر رکھا ہے۔ اب یہ اس کی ذہنی صلاحیت ہے کہ وہ کس طریقے سے اور کس حد تک اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

''میں نے شعبہ تحقیق کا انتخاب اپنی فطرت کے عین مطابق کیا، دراصل بچپن ہی میں تلاش، جستجو کا عمل میری زندگی کا حصہ بن گیا، ہر چیز کو سمجھنا، غور کرنا کہ یہ چیز کیوں ہے، کیا ہے؟ فلاں شاعر یا ادیب کس حال میں تھا، اور کیوں تھا؟ اور اس نے کیا کیا لکھا؟ یہ سوالات اکثر میرے ذہن میں ابھرتے تھے، یہی میرا مزاج بن گیا۔''(۷)

ڈاکٹر صاحب کے فطری محقق ہونے کی ایک یہ دلیل بھی ہے کہ قدیم تحریریں، مطبوعات، مخطوطات ہمیشہ ان کی توجہ کا مرکز بنتے رہے، وہ کڑی سے کڑی ملانے کی کاوش میں تحقیق کرتے رہے۔ مثال کے طور پر قدیم تحریروں یا مخطوطات سے اہم نکات غور و فکر کے بعد فوراً نکال لیتے۔ پھر ان کو سامنے رکھتے ہوئے تحریر کا مطالعہ کرتے۔ اس سے متعلقہ جتنا مواد ملتا اس کو جمع کرتے ہوئے تقابلی مطالعہ بھی کرتے۔ ان کی محققانہ صفات میں سے ایک منفرد صفت یہ تھی کہ اگر حوالے کے طور پر انھیں کسی مضمون، کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے کام کو ہی روک دیتے اور جب تک انھیں مطلوبہ کتاب یا مضمون دستیاب نہ ہو جاتا کام کو آگے نہ بڑھاتے۔ یعنی اپنے متعلقہ موضوع کے متعلق ہر حوالے کی کتاب ان کے لیے اہم ہوتی خواہ کتنی ہی نادر کیوں نہ ہوتی۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے یہ عادت طالب علمی کے زمانے سے ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

''مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کا یہ واقعہ اب تک یاد ہے کہ ایک مرتبہ

علامہ ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم نے خارجی شواہد کے سلسلے میں مجھے ایک ایسی نادر کتاب کے مطالعے کا مشورہ دیا جس کا ایک نسخہ جرمنی میں تھا، میں نے اس کے حصول میں معذوری ظاہر کی تو انھوں نے فرمایا کہ حکیم، ڈاکٹر ایک دوا کے میسر نہ ہونے پر کوئی دوسری دوا تجویز کر سکتا ہے لیکن ریسرچ کے سلسلے میں جو کتاب تجویز کی جائے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنی ہوگی کیوں کہ اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔''(۸)

انھوں نے کبھی اپنے تحقیقی کام کو حتمی نہیں سمجھا، کیوں کہ تحقیق ایک ایسا سمندر ہے جس کی کوئی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ اپنی طرف سے محقق کتنا ہی مستند یا معتبر حوالوں کے ساتھ اسے مکمل کرے۔ کوئی ہلکا سا اشارہ اس کی تحقیقی بنیادوں کو مسمار کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی محققانہ شخصیت جن اجزا سے ترتیب پاتی ہے اس میں یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ محقق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ وسیع النظر ہو۔ وہ وسیع النظر اس وقت ہو سکتا ہے جب اسے دیگر علوم وفنون سے بھی کماحقہٗ واقفیت ہو۔ بقول مسرور احمد زئی:

''وہ بنیادی اوصاف جو ایک محقق کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف علم وفنون میں مہارت، وسعت نظر، مطالعہ تاریخ وتہذیب اور علم قرآن وحدیث یہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں مستزاد اوصاف کی حیثیت سے ہیں۔''(۹)

ڈاکٹر صاحب متعصب نہیں تھے، اس لیے ان کی تحقیق میں غیر جانبدارانہ رویہ ملتا ہے۔ اگر ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے ہی کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنی دلچسپی کا میدان دیکھا۔ چوں کہ فارسی سے خاص شغف تھا اس لیے فارسی شاعری ہی کو ترجیح دی۔ اپنے استاد مولا ضیا احمد بدایونی کی مشاورت سے حسن غزنوی (م، ۵۵٦ ھ) فارسی شاعر کا انتخاب کیا۔ حسن غزنوی پر پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام اتنا آسان نہیں تھا کیوں کہ وہ سنائی شاعر (م، ۵۱۵ھ) کا

معاصر تھا اور انھوں نے نہ صرف ایران کے مختلف علاقوں کی سیر کی بلکہ افغانستان اور ہندوستان تک کا بھی سفر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تمام باتوں کا کھوج ان کے کلام کے ذریعے لگایا۔ یہ ان کی تحقیق شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے شاعر (حسن غزنوی) کے عہد کی مکمل تاریخ بھی مرتب کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے سفر کو سلسلہ وار تحریر کیا کہ کس طرح شاعر نے بغداد سے مدینہ منورہ تک کا سفر طے کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے شاعر کے ایسے قصائد کے متعلق معلومات فراہم کیں، جو اس نے عربی میں تحریر کیے تھے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کی عربی سے شناسائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے عربی قصائد کی قرأت، تفہیم کے علاوہ اس کے دور کا تعین کیا اور شعرا پر حسن غزنوی کے عربی قصائد کے اثرات بھی تلاش کیے۔ بقول مسرور احمد زئی:

> ''یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا پہلا طویل تاریخی اور غیر معمولی کام ہے۔ جس میں تحقیقی حوالوں کے ساتھ شاعر کی زندگی، اس کی مصروفیات، کلام میں اور اس کی تراکیب ولفظیات، اس کی فکر اور رجحان اور کلام میں خوبی وخامی کے علاوہ اس کے، ممدوحین کے تاریخی واقعات کے ساتھ معاصرین کے کلام سے تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو یقیناً محنت طلب، صبر طلب اور دقت طلب کارنامہ ہے۔ (۱۰)

آج سے آدھ صدی پہلے یہ تحقیقی کام منظر عام پر آیا تب رابطہ کرنا یا ایک سے دوسری جگہ جانا اور مآخذ تک رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ پھر یہ کہ نسخوں میں اختلاف نے یہ مسئلہ اور بھی بڑھا دیا ڈاکٹر صاحب نے نہایت محنت سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دور دراز کا سفر کیا کتب خانوں تک رسائی حاصل کی اور مختلف بیاضوں، لغات اور تذکروں کا مطالعہ کیا۔ لندن اور پیرس کی لائبریریوں سے شاعر کے دیوان کے عکس حاصل کیے اور پھر ان کی صحیح قرأت کے لیے اساتذہ سے بھی راہنمائی حاصل کی

ڈاکٹر صاحب نے دوران تحقیق مقالے کے موضوع پر کئی کتابوں سے استفادہ کیا لیکن خاص طور پر جن بنیادی مآخذ تک رسائی حاصل کی ان میں دیوان سید حسن غزنوی (انڈیا آفس

Ethe No:931) راحت الصدور، لباب الباب (محمد عوضی) تذکرۂ دولت شاہ (براؤن) تذکرۂ حسینی (حبیب گنج) دیوان نسائی، مجمع الفصحا، ریاض العارفین، ریاض الشعرا اور تاریخ بیہق شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تمام کتب کا مطالعہ کیا اور فارسی شعر وادب کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے قدیم شعرا کے حالات وافکار کو موضوع بناتے ہوئے ان کے عہد کے حالات کو مندرجہ تین کتابوں میں پیش کیا۔

۱۔ سید حسن غزنوی (اگست ۱۹۴۸ء تا فروری ۱۹۵۰ء بطور ضمیمہ اورئینٹل کالج میگزین) کتابی صورت میں ۱۹۹۹ء کو منظر عام پر آئی۔

۲۔ چند فارسی شعرا (۱۹۸۹ء)

۳۔ تاریخ بہرام شاہ انگریزی (۱۹۵۵) دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء

یہ تینوں کتابیں ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں لیکن پھر بھی منفرد تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں اختصار واختصاص کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ بہت پر اعتماد اور نہایت احتیاط سے اپنے تحقیقی مواد کی جانچ پرکھ کرتے تھے۔ محقق کی اردو کے ساتھ عربی وفارسی سے واقفیت ضروری ہے خاص طور پر فارسی میں کیوں کہ فارسی ایک زمانے تک ہندوستان کی سرکاری زبان رہی اور اس دور کا زیادہ تر سرمایہ فارسی میں ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب فارسی سے نابلد نہیں تھے۔ ان کے تحقیقی کام کی بہترین مثالیں وہ منسوبات ہیں یعنی وہ تحریریں جو کسی اور مصنف کی تھیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے مصنف یا مؤلف سے منسوب ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ژرف بینی اور بصیرت نے انھیں ڈھونڈ نکالا۔ خاص طور پر فارسی دواوین کے متعلق ان کی معلومات اہم ہیں۔ منسوبات سے متعلق ان کا ایک مجموعہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں چار دواوین پر تحقیقی مضامین اور ایک مضمون چند مظلوم کتابوں کے عنوان سے بھی شامل ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے متعلق داخلی شہادتیں جمع کیں جن سے یہ ثابت کیا کہ یہ فارسی دیوان شیخ عبدالقادر جیلانی سے غلط منسوب کیا گیا ہے۔ یہ فارسی دیوان نول کشور نے دلائل کے ساتھ ۱۸۸۳ء میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مکمل طور پر داخلی شہادتوں سے کام لیا اور درست

حقائق سامنے لے کر آئے۔اسی طرح دیوان قطب الدین بختیار کا کیؒ سے متعلق منسوب فارسی دیوان ہے۔اس میں انھوں نے بختیار کا کیؒ کے شعری ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے دلائل دیے۔ مزید ایسے اشعار بھی فراہم کیے جن میں بعد کے شعرا کا تتبع نظر آتا ہے۔اصطلاحات پر بھی بحث کی اور تذکروں سے استفادہ کیا۔ فارسی کے شاعر ظہیر فاریابی خاص شہرت کے حامل ہیں۔نول کشور نے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ سے دیوان ظہیر شائع کیا۔ڈاکٹر صاحب نے ایسی داخلی شہادتیں اور دلیلیں دیں جو دیوان کے ظہیر فاریابی سے غلط منسوب ہو جانے کو ظاہر کرتی ہے۔

عمادی غزنوی یا عماد شہریاری پر ڈاکٹر صاحب نے معارف، رسالہ مارچ ۱۹۴۷ء میں ایک مضمون لکھا۔جس میں ان وجوہات کی طرف اشارہ کیا کہ کس طرح متاخرین نے بعض اہل علم کی تقلید میں عمادی غزنوی اور عمادی شہر یاری کو ایک ہی شاعر قرار دے دیا لیکن پھر از سر نو اس موضوع پر تحقیق کی اور ڈاکٹر صاحب نے اس بات کی تصدیق کی کہ عمادی غزنوی اور عمادی شہر یاری ایک ہی شاعر کے دو نام ہیں۔ولی دکنی پر تحقیق کرتے ہوئے ماہر لسانیات کے طور پر بھی نظر آتے ہیں۔بقول مشفق خواجہ:

> ''حضرت موصوف ہمارے ان اکابر میں سے ہیں جن کی ذات بابرکات اپنے علمی وروحانی درجات کی بلندی کی وجہ سے ایک مستقل فیض جاریہ کا درجہ رکھتی ہے۔انھوں نے علم کو عبادت کے درجے تک پہنچا دیا ہے اور یہی وہ علم ہے جسے اصطلاحاً علم نافع کہا جاتا ہے۔یعنی ایسا علم جو انسانی زندگی کو زندگی دینے والے کی رضا کے مطابق روشن ومنور کر دے۔''(۱۱)

(ب) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت نقاد

ڈاکٹر صاحب کی علمی وادبی خدمات کے کئی گوشے اور پہلو ہیں۔ان کا شمار ناقدین ادب میں بھی ہوتا ہے۔یعنی محقق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاحب بصیرت نقاد بھی تھے۔قیام پاکستان کے بعد جو نام اہم ناقدین کے طور پر سامنے آتے ہیں ان میں مولوی عبدالحق، وقار عظیم،

عبادت بریلوی اور عندلیب شادانی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، شوکت سبزواری، محمد حسن عسکری، محمد احسن فاروقی، حامد حسن قادری اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں شامل ہیں۔ یہ وہ ناقدین ہیں جو ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ پاکستان آنے کے بعد تحقیقی و تنقیدی میدان میں خاص مقام رکھتے ہیں۔

اگر ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی کام کو دیکھا جائے تو انھوں نے تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کی تعداد برابر ہے۔ اگرچہ بہ حیثیت محقق ان کی پہچان زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہ حیثیت نقاد کے ان کا تنقیدی کام پس پشت چلا گیا ہے۔ اکثر ناقدانِ فن ڈاکٹر صاحب کو بہ طور محقق ہی تسلیم کرتے ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے تنقید میں فکر کو خاص مقام دیا۔ ان کے چند ایک ایسے مضامین بھی ہیں، جو ادبی تحریکات یا دوسری اصناف ادب کے متعلق ہیں۔ ان کو بھی تنقیدی تحریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ عبادت بریلوی کے خیال میں:

> ''جب ہم تنقیدی ادب کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ عدل، انصاف، رائے دینا یا کسی قسم کا حکم لگانا ہی تنقید نہیں ہے بلکہ وہ تمام ادب تنقید کے تحت شمار کیا جا سکتا ہے جو ادب کی دوسری اصناف کے متعلق لکھا گیا ہو، چاہے وہ ان اصناف کی تشریح کرے، تجزیہ کرے یا ان کی قدر و قیمت کا پتا لگائے یا اس کی تحریر میں بیک وقت یہ تمام خصوصات نمایاں ہوں۔''(۱۲)

ڈاکٹر صاحب کے اکثر تحقیقی مضامین و مقالات میں تنقیدی اشارات ملتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایسی تصانیف قابل تنقید اور توجہ طلب ہیں جن میں کسی نہ کسی اخلاقی پہلو کی نشاندہی کی گئی ہو اور جن تحریروں میں اخلاقی اقدار کی پامالی ہو ان کو تنقیدی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔ چوں کہ وہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جس میں اخلاقی اقدار کی پاسداری ملتی ہے۔ اسی لیے ادب میں بھی ایسی تحریریں پسند کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی بیشتر تنقیدی تحریریں فارسی اور اردو شاعری سے متعلق ہیں لیکن فارسی

شاعری پر تنقیدی حصہ تحقیقی مضامین ہی میں ملتا ہے جب کہ اردو شاعری پر انھوں نے الگ سے تنقیدی مضامین لکھے۔ اگر ان کی تنقیدی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ داخلی شہادتوں یعنی شاعر کے کلام ہی سے تمام معلومات اخذ کر لینے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ شاعر یا ادیب اس کے معاشی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے رجحانات کا کھوج لگاتے اور اس کے دور کے تاریخی واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے کلام کا جائزہ پیش کرتے۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب شاعر کے مزاج اور تراکیب پر بھی بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ معاصرین سے تقابلی جائزہ میں ان واقعات کا ذکر کرتے جو کسی بھی شاعر کی پیروی کی وجہ بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود شاعر کے دوسرے شعرا پر اثرات کو بھی موضوع بناتے۔

ڈاکٹر صاحب فارسی داں تھے۔ انھوں نے تنقید میں شائستگی کو برقرار رکھا۔ ان کی تحریروں میں کسی کے خلاف کسی بھی قسم کا پروپیگنڈہ نہیں ملتا۔ وہ حتیٰ الامکان کوشش کرتے کہ شاعر کے میلان طبع، مزاج، ماحول اور فکر وغیرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا اصل مقام و مرتبہ متعین کریں۔ ان کی تنقید میں تاریخی رجحان (Historical Trend) کا غلبہ نظر آتا ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی کتاب فسانۂ عجائب کے جواب میں ''فخر الدین سخن'' نے بھی کتاب لکھی۔ سخن نے کئی مقامات پر سرور کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں تصانیف کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے اسلوب، محاورات اور زبان پر بحث کی اور آخر میں اپنی رائے پیش کی۔ فسانۂ عجائب میں سرور سے غلط منسوب اشعار کی وضاحت کی اور دلائل کے ساتھ سخن کے مقابلے میں سرور کو زیادہ باصلاحیت مصنف قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۰ء میں باقاعدہ تحقیقی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا لیکن تنقیدی مضامین کا سلسلہ اس سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ یہ مضامین کنگ ایڈورڈ کالج کے میگزین میں یکے بعد دیگرے ''پیام اقبال'' اور ''امیر اور داغ'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے تھے۔ ''پیام اقبال'' تنقیدی حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مضمون ہے جب کہ اقبال کے حوالے سے پہلا مضمون ہے۔ یہ مضمون انھوں نے کسی (ناقد کا نام معلوم نہیں) کی

رائے کے جواب میں لکھا کہ اردو شاعری میں پیام نہیں ہے۔ انھوں نے پیام کی وضاحت کی اور پھر پیام اور پیامبر کو صراحت سے بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تنقیدی مضمون میں اقبال کے علاوہ اکبر اور حالی سے بھی استفادہ کیا۔ امیر اور داغ پر مضمون کل دس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ان شعرا کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بقول مسرور احمد زئی:

''اس میں ہمارے ناقد کی تنقیدی رائے متوازن ہے اور اسلوب رواں۔
اس مضمون میں ہم بعض ایسے الفاظ دیکھتے ہیں جو بعد میں ہمارے نقاد کے
یہاں ارتقائی سفر کی وجہ سے ختم ہو گئے۔''(۱۳)

بعض مقامات پر ان کی تحریر طوالت اختیار کر گئی ہے اگر چہ بعد کی تحریروں میں اختصار ہے۔ اسی میگزین میں ایک مضمون ''میر'' کے عنوان سے لکھا۔ اگر چہ یہ مضمون طلبا کی درسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھا گیا لیکن یہ مضمون میر تقی میر کے متعلق تمام اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ اس میں چند ایک ضمنی عنوانات، حالات، حیات، آشفتہ حالی، استادی، میلان طبیعت، تصانیف اور موزانہ میر و مرزا بھی دیے گئے ہیں۔ ''موزانہ میر و مرزا'' تنقیدی مضمون ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں بھی میر کی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس موازنہ سے پہلے یہ تحریر موجود ہے کہ ان دو شخصیات کا تقابل ممکن نہیں۔ کیوں کہ ان کے مزاج، طرز بیان و طرز تحریر میں کوئی مناسبت نہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے موازنہ بھی مختلف انداز سے کیا ہے۔ سودا کو اردو ہجو نگاری کا امام کہا ہے۔ اس مضمون کے آخری حصے میں ان دونوں شعرا کے طبقات کے اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے کلام کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور ایک ہی مضمون یا بحر کے اشعار کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی مضامین ناگ پور یونی ورسٹی جنرل میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک تو مسلسل شائع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی کتاب ''تحریر و تقریر'' مطبوعہ (۱۹۶۲ء) میں ایک مضمون بہ عنوان ''درد کا تصوف کیا تھا، اور کیوں تھا؟'' شامل ہے۔ یہ مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے دردؔ

فہمی کے حوالے سے خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی تنقیدی فہم وفراست سے کام لیتے ہوئے درد کے متعلق ضروری معلومات دیں ہیں اور درد کا تصوف کیا تھا اور کیوں تھا؟ جیسے سوالات کے جوابات فراہم کیے ہیں۔

انھوں نے اس عہد کی کتابوں اور درد کے عہد کی تصانیف اور چند ایک شخصیات کے ذکر سے مضمون مکمل کیا ہے۔ ان کی تحریر یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ بزرگ تھے۔ انھوں نے تصوف کے نظریات، صوفیوں کے اقوال اور قرآنی تلمیحات کو بھی بیان کیا ہے۔

خواجہ میر درد کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب کی تصنیف ''نالۂ عندلیب'' صوفیانہ خیالات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف ایک ہی جملے میں آزاد کی تحقیق پر اس تصنیف کے حوالے سے تنقید کی ہے کہ ''یہ اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل وہی کتاب ہے جسے آزاد نے صرف رسالہ کہا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے مختلف نکات دلائل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے تنقید میں وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔

انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ''غالب اور صہبائی کی فارسی غزل'' کے عنوان سے مضمون لکھا جو بصائر رسالہ کراچی میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے غالب اور امام بخش صہبائی کی فارسی غزلیات کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا میں حالی کی ''یادگارِ غالب'' سے استفادہ نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں دونوں شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کیں ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں کے مضامین کو زیرِ بحث لاتے ہوئے صہبائی کے مضمون کو عام طرز جب کہ غالب کے ہاں جدت اور ندرت کو موضوع بنایا ہے۔ اسی طرح جن اشعار میں صہبائی کی بلند پردازی نظر آتی ہے اس سے بھی ژرفِ نظر نہیں کیا بلکہ مکمل دیانت داری سے ان کی تفصیل دی ہے۔ اسی طرح غالب کے ایسے اشعار دیے، جو ایک ہی موضوع کے حوالے سے ہیں اور غالب نے اردو اور فارسی میں معمولی تبدیلی کے ساتھ ادا کیے ہیں۔ اس کے علاوہ تراکیب، بندش الفاظ، خیال آفرینی، دوراز کار تشبیہات واستعارات بھی دیے ہیں۔ جہاں جہاں دونوں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اس کی وضاحت بھی خوب صورت انداز سے کی ہے۔ تنقید اسی صورت میں اثر رکھتی ہے جب

اس میں تحقیقی عنصر موجود ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے تنقید اور تحقیق کو ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ ان کے خیال میں '' بہ ہر حال غالبؔ اور صہبائی دونوں ظہوریؔ سے متاثر '' ہیں۔ اس کے حق میں دلیل دیتے ہوئے انھوں نے ایسے اشعار دیے ہیں جن میں خود غالب اور صہبائی نے ظہوری کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں اساتذۂ فن کی فارسی دانی پر بحث موجود ہے۔ معاصرین سے تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور جہاں دونوں شاعروں نے اساتذہ کی زمین میں اشعار کہے ہیں ان کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے '' غالب کے فارسی قصیدے '' کے عنوان سے ۱۹۶۲ء میں مضمون لکھا، جو بعد میں ۱۹۶۷ء میں '' احوال ونقدِ غالب '' میں بھی شامل ہوا۔ اس میں ان نکات کی وضاحت کی گئی ہے جن کی وجہ سے غالب نے اردو میں شہرت حاصل کی لیکن فارسی میں نہ کر سکے۔ اس میں ایک وجہ یہ ہے بیان کی کہ فارسی میں غالب نے زیادہ تر تقلید کی روش اپنائی۔ انھوں نے غالب کی تقلید فارسی کی کئی مثالیں اس مضمون میں تفصیل سے فراہم کیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ان جملوں سے وضاحت ہوتی ہے کہ '' تمہید، تشبیہ، اور مبالغہ آمیزی، توصیف سب کی سب انوری اور خاقانی وغیرہ کی تقلید میں ہے جب کہ ظہوری، نظیری اور عرفی وغیرہ کی زمینوں میں قدم جمائے گئے ہیں۔ ایک دو نہیں بلکہ متعدد تحریریں متاخرین کی ہیں اور الفاظ کی شان وشوکت بھی اسی انداز کی ہے۔ یہ دعویٰ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے دلائل کے طور پر متاخرین کے کلام سے مثالیں پیش کرتے ہوئے غالب کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے عرفی اور خاقانی کے کلام کو زیادہ پیش نظر رکھا ہے اور ایسے اشعار دیے ہیں جہاں غالب نے صرف لفظی الٹ پھیر سے خاقانی اور عرفی کے اشعار کو اپنا بنالیا ہے۔ بقول مسرور احمد زئی:

> '' اس قدر سخت گرفت ہونے کے بعد ہمارے ناقد کا قلم بہت ملائم رہا ہے۔ انھوں نے کئی مقامات پر غالب کا متاخرین کے ہم خیال ہونے کے باوجود اس بات کی تعریف کی ہے کہ جو تبدیلی غالب نے کی اس سے خیال

اور بلند ہو جاتا ہے، کہیں غالب کو سرقہ کا الزام نہیں دیا اور نہایت ہی سلیس
اور رواں انداز میں سخت موضوعات پر بات کرتے ہوئے تجزیاتی انداز
سے ایسے حقائق پیش کر دیے ہیں۔ جس سے غالب کی تقلید پسندی آشکار
ہو جاتی ہے۔''(۱۴)

''سودا کے قصیدے'' کے عنوان سے یہ مضمون '' صریر خامہ''(قصیدہ نمبر) ۶۸۔۱۹۶۷ء میں لکھا گیا۔ قصائد سے شاعر کے حالات وواقعات کو اخذ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سودا کے ۵۵ قصائد میں سے ان قصائد کا زمانی اعتبار سے تعین کیا ہے جو محمد شاہ اور خواجہ سرا نسبت خاں کی مدح میں لکھے گئے۔ مضمون کا ابتدائی حصہ سودا کے تعارف پر مبنی ہے۔ کیوں کہ اس میں سودا کے قصیدے کی تمہید، گریز اور تشبیب کا ذکر کرتے ہوئے مدعا پر توجہ بھی رکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ سودا کے قصائد پر فارسی شاعروں کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ایسے قصائد بھی زیر بحث لائے ہیں جن میں سودا نے دوسرے شعرا کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور دوسرے شعرا کا مذاق اڑایا ہے۔ مختلف شاہان اودھ کی شان میں لکھے گئے قصائد بھی اس مضمون کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سودا کے ذہنی وفکری ارتقا کو سمجھنے کے لیے قصائد کی زمانی ترتیب دی ہے۔ سودا کے قصائد میں الفاظ کے حسن اور الفاظ وتراکیب کی وضاحت کرتے ہوئے سودا کا مقام ومرتبہ متعین کیا ہے۔ یہ مضمون ان کی تنقید وتحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ''عزیز لکھنوی کے قصائد'' کے عنوان سے مضمون لکھا جو'' معارف'' میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے شاعر کے حالات زندگی، اس کے سیاسی حالات واقعات اور تاریخ کو پیش نظر رکھا۔ چوں کہ قصیدہ میں مبالغہ آرائی زیادہ ہوتی ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب نے قصیدہ کے پس منظر پر بھی نظر رکھی ہے۔ ان کے خیال میں ایسے تاریخی ماحول پر نظر رکھتے ہوئے شعرا کا کلام نہ دیکھا جائے تو قصیدہ نگاروں کی دروغ گوئی، خوشامد اور تذلیل نفس کی

باتیں بڑی حد تک حق بجانب سمجھی جائیں گی۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جس میں قصیدے کی اہمیت پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اردو فارسی قصائد کا بھرپور مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۱ء میں رسالہ المصطفیٰ (حیدر آباد) کے لیے ایک مضمون ''امیر مینائی کے قصائد'' کے عنوان سے لکھا۔ انھوں نے یہ مضمون امیر مینائی کے مجموعہ کلام ''محمد خاتم النبیین ﷺ'' کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا۔ یہ مجموعہ کلام پانچ قصائد، ایک سو چوالیس نعتیہ غزلوں، تین نعتوں، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف تین قصائد نعتیہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مجموعہ کلام کو موضوع بناتے ہوئے اپنی رائے دلائل کے ساتھ پیش کی ہے۔ انھوں نے اس مضمون کی تکمیل میں تحقیق وتنقید کو متوازن رکھا اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ قصائد کی تنقیدی تحریر میں یکسانیت برقرار نہ رہے اور یہی ان کی تنقیدی بصیرت کا خاصا ہے۔

''جگر کے تصورِ عشق'' کے عنوان سے یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ''تحریر وتقریر'' مطبوعہ ۱۹۶۲ء میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے جگر کے حالات واقعات کو موضوع بحث بنانے کے بجائے اس کے خیالات ونظریات پر نظر رکھی ہے۔ خاص طور پر تصورِ عشق کے حوالے سے اس مضمون میں اس طرح سے جگر کے تصورِ عشق پر بات کی ہے کہ ان کے عشق کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہوگئی ہے۔ یہ مختصر سا مضمون ہے لیکن اپنے موضوع کے حوالے سے جامع ہے۔ فرمان فتح پوری کے مطابق:

> ''اظہارِ خیال میں حد درجے اختصار سے کام لیتے ہیں۔ وہ شعوری طور پر ہر قسم کے اطناب سے بچتے ہیں............اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ باوجود ہندی، انگریزی، عربی، فارسی کے عالم کے ان کی تحریروں میں کہیں نمائش مسلم کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ لب ولہجہ ہر جگہ سنجیدہ اور متین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی معصومانہ خاکسارانہ ہوتا ہے۔''(۱۵)

ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی تعداد برابر ہے کچھ تنقیدی تحریریں

تصانیف پر بھی ہیں ۔ان کی تنقیدی تحریریں ،تبصروں ، دیباچوں اور مقدموں کی صورت میں ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب نے قاضی عبدالغفار کے تیسویں خط کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ۷اقسم کے مردوں کا حال اور ان کے مختلف گروہوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''لیلیٰ کے خطوط'' کے دوسرے حصہ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ کیوں کہ اس میں عورت کی نفسیات کھل کر سامنے آتی ہے کہ بری سے بری عورت بھی مرد پر رحم ضرور کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اٹھائیسویں خط کو بھی خاص طور پر مطالعہ کا موضوع بنایا۔ اس میں عورتوں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب نے ان خطوط کے تناظر میں انسانی جذبات اور عورتوں کی مذہبی واخلاقی تعلیم وتربیت کو بیان کیا ہے اور اپنی تحریر کو مختلف خطوط کے اقتباسات سے مزین کیا ہے۔ اس کے علاوہ اخلاقی اقدار پر بحث کرتے ہوئے اپنی ذات کو بھی طنز کا نشانہ بناتے ہیں ۔ یہاں اصلاحی تنقید کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ان کا ادبی مقام متعین کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

انھوں نے زبان وبیان اور املا پر گرفت کی ہے اور غلط تراکیب کی وضاحت بھی کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''ادب منزل بہ منزل ...... چند تنقیدیں'' سترہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس پر تنقیدی مضمون دسمبر ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مضمون کے مطابق اگر اس تصنیف کے مضامین کو دیکھا جائے تو اس میں کشفی ،روحانی اور لافانی ادب کے علاوہ لکھنؤ اور پنجاب میں اردو ادب کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اسے ایک بڑے عہد کے ادب کا مختصر جائزہ کہا ہے۔ وہ اس نظریے کے قائل نظر آتے ہیں کہ ادب تفنن طبع کے لیے نہ ہو بلکہ اس سے تشریح حیات اور اصلاحِ معاشرہ کا کام لیا جائے۔ اس میں مذہب کے ادب پر اثرات کو مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کا نظریۂ ادب اور نظریۂ تنقید سامنے آتا ہے۔ وہ مقصدی اور غیر مقصدی ادب کے ذیل میں مصنف سے ہم خیال نظر آتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق مقصدی ادب وہ ہے جو اخلاقی ادب کے مطابق ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو (جلد اول، دوم) پر تنقیدی وتعارفی مقالہ لکھا جو رسالہ ''تحقیق'' کے شمارہ نمبر۴ (۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا۔اس میں نہ صرف تاریخ ادب اردو کا تعارف ہے بلکہ جالبی صاحب کی تائید اور ستائش بھی کی گئی ہے۔ جہاں کہیں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی حواشی میں اس کا ذکر کر دیا ہے لیکن جابجا تعریفی کلمات بھی موجود ہیں۔ اس میں تنقید برائے تعمیر کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بعض ایسے تنقیدی مضامین بھی ہیں جو دیباچوں،تبصروں یا کتب پر نہیں بلکہ ان میں شخصیات کو ضمنی یا عمومی تنقید کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے درج ذیل مضامین اہم ہیں:

۱۔ برصغیر میں حق و باطل کے معرکے۔
۲۔ مسلمانوں کا علم وادب برصغیر میں۔
۳۔ اُردو کا دینی ادب (۱۸۵۷) کے بعد۔
۴۔ تہذیب جدید کا فکری بحران (اردو ادب کے آئینے میں)

(ج) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت ماہر لسانیات

علم لسانیات ایک مشکل علم ہے کیوں کہ اس کا مطالعہ بہت وسعت لیے ہوئے ہے۔اس میں کسی ایک زبان کے مطالعہ میں دنیا کی قابل ذکر زبانوں کا نہ صرف مطالعہ کرنا ہوتا ہے بلکہ ان کا پس منظر،اساس اور ارتقا پر نظر رکھی جاتی ہے۔اس کے علاوہ زبان کی حالیہ صورت حال سے بھی واقفیت ضروری ہے اور زبان چوں کہ تبدیل ہوتی رہتی ہے اس لیے ماہر لسانیات کو ان عہد بہ عہد تبدیلیوں سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔

زبان ارتقا پذیر ہے اس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور یہ دوسری زبانوں کے اثرات بھی قبول کرتی ہے۔ ماہر لسانیات کو علم میں اضافے کی ضرورت ہر لمحہ پیش آتی ہے۔لسانیات علم کی ایک مختلف شاخ ہے۔ یہ علم مشکل اس لیے ہے کہ کئی

اقوام ایک زبان کی نشو ونما کرتی ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق:

''جب ایک قوم کا کسی دوسری قوم سے سابقہ پڑتا ہے یا آپس میں ربط ضبط پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ کسی وجہ سے ہو، ایک کے لفظوں کا دوسرے کی زبان میں داخل ہونا لازم ہے، مثلاً اردو یا انگریزی جیسی مخلوط زبانوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ آنا ناگزیر تھا۔ دونوں زبانوں کا میل یا تو بالواسطہ ہوتا ہے یا بلاواسطہ۔ بالواسطہ تو دونوں کے بولنے والوں کے میل جول سے ہوتا ہے اور بلاواسطہ ادب کے ذریعے۔''(۱۶)

زبان میں ارتقائی عمل قدرتی طور پر ہوتا رہتا ہے۔ ہر زبان اپنے انداز بیان، اسالیب، تراکیب اور مزاج نیز ساخت کے اعتبار سے اپنا الگ وجود اور جہان رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک زبان جن زبانوں سے مل کر بنتی ہے ان سے بھی الگ جہاں معانی کی مالک ہوتی ہے۔ اردو زبان نوعیت کے اعتبار سے ایک ایسی ہی زبان ہے، جو ایک طرف اگر سلسلے کے اعتبار سے دیکھا جائے آریائی زبان سے ملتی ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی زبانیں اس میں دخیل نظر آتی ہیں۔ اس لیے ماہر لسانیات کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ دیگر کئی زبانوں سے بھی واقفیت ضروری ہے جن سے اردو کے لسانی روابط رہے۔ چوں کہ ایک محقق ماہر لسانیات بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب محقق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر لسانیات بھی ہیں۔ اس لیے انھیں اردو کا معتبر اور مستند حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وفا راشدی کے خیال میں:

''ڈاکٹر صاحب ماہر تعلیم ہی نہیں ماہر لسانیات بھی ہیں۔ عربی فارسی، اردو، انگریزی، ادبیات میں کامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام، یہ کمال وسیع و عمیق مطالعہ، ان تھک محنت، شب و روز کی لگن اور خداداد ذہانت وصلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔''(۱۷)

ڈاکٹر صاحب نے علم لسانیات با قاعدہ حاصل کیا۔ لسانیات سے متعلق بنیادی سوالات

یہ ہو سکتے ہیں کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کا ملاپ ہوتا ہے یا نہیں؟ زبان اپنا وجود کیسے برقرار رکھتی ہے؟ اس قسم کے کئی اور سوالات کے جوابات ڈاکٹر صاحب فراہم کرتے ہیں۔ ایک زبان کئی زبانوں سے مل کر اپنے پر پُرزے نکالتی ہے اور پھلتی پھولتی ہے۔ دنیا میں صرف وہی زبانیں زندہ رہتی ہیں، جو دوسری زبانوں کے لیے اپنا دامن کشادہ رکھتی ہیں۔ زندہ زبانیں ماحول، حالات واقعات اور زمانہ سے اثرات قبول کرتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

> ''سنسکرت، جسے دیوبانی سمجھ کر فطری تبدیلیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی، آج آثارِ قدیمہ میں محسوب ہوتی ہے اور اس کی ذریت جس میں خود ہماری اردو شامل ہے زمانے کے ساتھ چل کر آج پورے برصغیر پر معترف ہے۔''(۱۸)

ڈاکٹر صاحب اردو، انگریزی، ہندی، عربی اور فارسی میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ چوں کہ ان کا مختلف زبانوں کے ادب کا گہرا مطالعہ تھا اس لیے ان زبانوں کے لسانی روابط سے بھی آگاہ تھے۔ انھوں نے بعض زبانوں (جن میں عربی اور فارسی شامل ہیں) کے صوتی نظام اور لسانی مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔ اردو کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اردو غریب زبان ضرور ہے مگر ایسی خلیق اور ملنسار کہ کسی نے نظرِ عنایت کی تو اس کی ہوگئی، آج جو لوگ اردو کو کسی خطے کی زبان کہتے ہیں اور اردو کے دوسرے چاہنے والوں کو اہلِ زبان نہیں سمجھتے وہ اردو کے مزاج اور اس کے افتادِ طبع کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لسانیات کا مضمون یونی ورسٹی میں پڑھاتے بھی تھے۔ انھوں نے کئی ایسے مضامین لکھے، جن میں لسانیات کی رو سے شعرا کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں اردو یا فارسی شاعروں کی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔ ان کی لسانیات کے حوالے سے تصنیف ''فارسی پر اردو کا اثر'' خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تصنیف ایک طرف ان کی علم لسانیات پر غیر معمولی گرفت کو واضح کرتی ہے تو دوسری طرف ایسے نتائج سامنے لے کر آتی ہے، جو لسانیاتی تحقیق کے زمرے میں اضافے کا سبب بنے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فارسی کے ذخیرہ الفاظ میں ایسے الفاظ تلاش کیے، جو اردو میں مستعمل ہیں جیسے دشمن، شگون، دشنام وغیرہ۔ اس کے علاوہ تجوید کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا علم لسانیات کے حوالے سے دوسرا اہم تحقیقی کام ''اردو املا کی تاریخ'' ہے۔ اس میں قدیم اردو اور حرف پر تحقیق کی گئی ہے لیکن جیسے ہی ڈاکٹر صاحب حیدر آباد منتقل ہوئے ان کی دلچسپی اردو اور سندھی کے لسانی روابط میں پیدا ہوگئی۔ انھوں نے ڈاکٹر نبی بخش کی معاونت سے اردو سندھی لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔

انھوں نے ''فارسی پر اردو کا اثر'' میں تفصیل کے ساتھ لسانی روابط کو موضوع بحث بنایا ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ عربی بھی ان کا موضوع بنی۔ یہاں پر چند ایک نکات پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ عربی پر فارسی اثرات اور فارسی پر عربی اثرات۔

۲۔ اسی طرح لفظ ''ششدر'' سب سے پہلے جس نے استعمال کیا۔ اس کے متعلق معلومات ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

کئی علمی نکات ایسے ہیں جو طویل ہونے کے سبب یہاں پیش نہیں کیے جا سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ایک ماہر لسانیات کا تجوید اور قرأت کے فن سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے تجوید اور قرأت کے اصولوں کی وضاحت بھی کی ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے مطالعہ میں وہاں کی تہذیب وثقافت، ماحول اور جغرافیائی حدود کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اگر چہ لسانیات ایک مشکل موضوع ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے لیے اسلوب اتنا سلیس اور رواں اپنایا کہ اقتباسات طوالت اختیار نہیں کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کے یہاں ایسے موضوعات ملتے ہیں، جو ان سے پہلے کسی ماہر لسانیات کے ہاں اتنی تفصیل سے نہیں ملتے، جیسے ادغام کا قاعدہ، امالے کا اصول، الفاظ میں تبدیلی یا تلفظ میں تبدیلی کے اصول، املا کے اصول وضوابط اور صرف ونحو وغیرہ۔ اردو زبان سے متعلق ان کی رائے دوسرے ماہرین لسانیات سے مختلف نہیں کیوں کہ اردو کا ذخیرہ الفاظ میں دوسری زبانوں کے زیادہ تر الفاظ شامل ہیں۔

(د) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت لغت نویس

ڈاکٹر صاحب لغت نویس بھی تھے۔اس سلسلے میں ''سندھی اردو لغت''، ''اردو سندھی لغت''، ''اردو ڈکشنری بورڈ کی لغت'' اور ''ہمارا تلفظ (جائزہ)'' منظر عام پر آئیں۔ڈاکٹر صاحب کا لغت نویسی کے حوالے سے ابتدائی باقاعدہ اور باضابطہ کام ''سندھی اردو لغت'' کا ہے۔انھوں نے یہ کام ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے ساتھ مل کر مکمل کیا۔

۵۴۔۱۹۵۳ء میں اردو کی ترویج وترقی کے لیے حکومت پاکستان (وزارت تعلیمات) نے ایک منصوبہ بنایا، جس کے تحت سندھ یونی ورسٹی کو فنڈ دینے کی پیش کش کی گئی۔اس وقت کثیر تعداد میں لوگ ہجرت کر کے آرہے تھے درحقیقت یہ منصوبہ اردو اور سندھی زبانوں کے بولنے والوں کی آسانی کے لیے بنایا گیا۔لہٰذا دو لغات ''سندھی اردو لغت'' اور ''اردو سندھی لغت'' ترتیب دینے کا لائحہ عمل بنایا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کا انتخاب ان لغات کے اردو حصے کے لیے کیا گیا اور سندھی حصے کے لیے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ منتخب کیے گئے۔ابتدائی مرحلے میں ان لغات کا خاکہ تیار ہوا تاکہ اسے معیاری اور جامع بنایا جاسکے۔کیوں کہ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا کام تھا جس کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔یہ اردو اور سندھی کے حوالے سے پہلا کام تھا۔سرمایہ اور وقت کی کمی کے پیش نظر اس خاکے میں تبدیلی کردی گئی اور کچھ اصول مقرر کیے گئے۔صفحات کی تعداد ۵۰۰ تک رکھنے کی حد مقرر ہوئی۔طلبا سے زیادہ عام لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے ترتیب دینے کا فیصلہ کیا گیا۔۵۵۔۱۹۵۴ء میں اس منصوبے کو آخری شکل دی گئی ''سندھی اردو لغت'' کا مسودہ (۵۵۔۱۹۵۶ء) میں تیار ہوا۔اس کی تیاری کے دوران مرتبین کو اس کی افادیت کا اندازہ ہوا۔اس لیے اس کے الفاظ کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور صفحات بھی ۸۶۶ ہوگئے۔اس میں ۲۳۶۳۵ الفاظ ومحاورات شامل ہیں۔طوالت کے سبب ایسے عربی وفارسی الفاظ حذف کردیے گئے، جو اپنی اصل شکل میں اردو وسندھی میں مستعمل ہیں۔الفاظ کے ہجے کی ترتیب، سندھی ادبی بورڈ کی ''سندھی لغت'' کی طرز پر رکھی گئی۔طلبہ

کی آسانی کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے لغت میں حرف وصوت کی شکل تبدیل نہیں کی گئی کیوں کہ ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔ دوسری لغت ''اردو سندھی لغت'' ہے۔اس کا مسودہ ۵۶۔۱۹۵۷ء میں تیار ہوا اور یہ ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آئی۔اس میں ۱۹۶۲۰ الفاظ ہیں۔

ان لغات میں درج ذیل چار باتوں کوملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ بجٹ، وقت، دونوں زبانوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور اہل قلم سے زیادہ طلبا کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا۔اس کے لیے ابتدائی خاکہ میں جو اصول وضوابط مقرر کیے گئے انھوں نے لغت کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ پہلی لغت میں اگر سندھی سے اردو معنی تلاش کیے جائیں تو اکثر الفاظ کا تعلق سندھی ہی سے نظر آتا ہے۔اس لیے اردو لغت میں مقدمہ سندھی میں لکھا گیا ہے۔

۱۹۵۸ء میں وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کی ایک قرارداد کے ذریعے ترقی اردو بورڈ موجودہ اردو ڈکشنری بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس ادارے کے ذمہ اردو کی ترقی وترویج کے علاوہ اہم ترین کام جامع لغت کی تیاری بھی تھا تا کہ انگریزی کی آکسفورڈ ڈکشنری کی طرز پر لغت تیار کی جا سکے۔ یہ کام الف مقصورہ سے شروع ہوا۔مولوی عبدالحق اس کے پہلے مدیر تھے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں پہلی جلد ہی سے مجلس مشاورت میں رہے۔ یہ مجلس لغت کے مسودے کی آخری منظوری دیتی ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ''اردو لغت بورڈ کی اردو لغت کا آخری مسودہ نظر ثانی کے لیے عام طور پر انھیں ہی (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ) بھیجا جاتا ہے۔''[۱۹]

ڈاکٹر صاحب کو الفاظ کی سند میں اشعار پیش کرنے میں خاص ملکہ تھا۔املا پر عبور ہونے کی وجہ سے عربی الفاظ کی اصلاح قرآنی آیات سے کر دیتے۔ جوابات طویل دینے کے بجائے مختصر لکھ دیتے۔غرض اردو ڈکشنری بورڈ کا آخری مسودہ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزر کر اشاعت کے مرحلے میں داخل ہوتا۔ اردو صرف ونحو اردو لغت کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ضخیم کتاب صرف ''نحو'' کے حوالے سے لکھی ہے۔انھوں نے اردو نحو کے اصول وضوابط مثالوں سے واضح کیے ہیں اور ایسے الفاظ بھی دیے ہیں جن کا املا اب غلط ہو چکا ہے۔

(ہ) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت اقبال شناس

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے زمانہ طالب علمی سے اقبال کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شعور میں پختگی آتی گئی۔ اب انھوں نے اقبال کے نئے در وا ہوتے دیکھے۔ ڈاکٹر صاحب کو اقبال سے فکری ہم آہنگی تھی کیوں کہ ان کا رشتہ بھی اسی تہذیب اور فکر سے جڑا ہوا ہے جس سے اقبال کا تھا۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں:

> ''عقائد کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے اور اخلاق سے جذبات متاثر ہوتے ہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر جذبات سے کلام بھی اثر پذیر ہوتا ہے۔ جو لوگ ظاہر و باطن میں فرق رکھتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے زبان و بیان کی خوبی یا تجربات و مشاہدات کی ترجمانی سے یقیناً اثر آفرینی پیدا کر سکتے ہیں لیکن ایسا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔''[۲۰]

ڈاکٹر صاحب پر اقبال کا خاص اثر نظر آتا ہے۔ اس لیے اقبالیات ان کا ایک خاص شعبہ اور اہم موضوع ہے۔ انھوں نے اقبال پر پہلا مضمون ۳۸۔۱۹۳۷ء میں کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی کے میگزین میں ''پیام اقبال'' کے عنوان سے لکھا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر ۲۵ سال تھی۔ یہ مضمون کسی مضمون کے جواب میں لکھا گیا جس میں اردو شاعری پر تنقید کی گئی تھی کہ یہ پیام سے خالی ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے یہ مضمون لکھا اور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ اس میں پیام موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی نقطۂ نظر کے تحت حالی، اکبر اور اقبال پر بحث کی ہے۔ یہ مضمون آٹھ صفحات پر محیط ہے۔ اسلوب میں تیکھا پن ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اقبال پر دوسرا مطبوعہ مضمون ''اقبال اور سیاست'' ہے۔ یہ بھی متذکرہ بالا میگزین میں شائع ہوا۔ یہ مضمون پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں اقبال کی تخلیقات میں سیاسی نظریات کے حوالے سے بحث موجود ہے۔ ۱۹۶۱ء تک اپنے موضوع پر اقبال اور سیاست کے حوالے سے پہلا مضمون ہے۔ اس کے بعد تو بہت سے مقالات اس حوالے سے

منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا اسی نوعیت کا ایک اور مضمون ''کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر'' بھی ہے۔ اگر بالترتیب ان دونوں مضامین کا مطالعہ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کا ذہنی ارتقا بھی سامنے آتا ہے۔ انھوں نے ایک مضمون ''اقبال اور سیاست'' کے عنوان سے لکھا، جس میں یہ وضاحت کی ہے کہ اصل شاعری گل وبلبل، ساقی وشراب نہیں بلکہ شاعری وہ ہے، جو عشق وآگہی، خودشناسی اور خودی کا درس دے۔

ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی چند ایک علامات مثلاً مردمومن اور شاہین کو سیاسی تناظر میں دیکھا ہے۔ انھوں نے اقبال کو فکر قرآنی کا علم بردار شاعر قرار دیا ہے، جو ایک مسلم معاشرے کا خواہاں ہے۔ اقبال نے جس طرح شاعری کے ذریعے سیاست کی ہے اور اس نکتے کی وضاحت بھی کی ہے۔ اقبال نے ایک طرف تو قوم میں خودی، ولولہ اور جوش پیدا کیا اور دوسری طرف حاکم وقت کے سوالات کے جوابات بھی فراہم کیے۔ اس مضمون میں تین اہم باتیں ملتی ہیں۔ اول اقبال کے عقائد (اسلامی فکر کے حوالے سے) دوم اقبال کی مسلمانوں سے وابستہ امیدیں، سوم اقبال کا سیاسی شعور۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان تینوں موضوعات پر بحث کی ہے۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک اقبال کے حوالے سے کوئی مضمون سامنے نہیں آتا۔ کیوں کہ وہ اس عرصے میں پی ایچ ڈی کے مقالے میں مصروف رہے۔ ۱۹۶۹ء میں ''کلام اقبال کا سیاسی پس منظر'' آیا اور اس مضمون میں تبدیلی کرنے کے بعد اس کا نام ''کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر'' رکھا گیا اس کے علاوہ اقبال کے حوالے سے ''تلمیحات اقبال سیرت النبی ﷺ سے'' اہم مضمون ہے۔ یہ رسالہ ''الحسن'' (رام پور) سے دسمبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے کل ۱۵ صفحات ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی عشق رسول ﷺ میں دلی کیفیات کو بیان کیا ہے اور سیرت پاک کے متعلقہ اشعار کے سلسلے میں قرآن پاک کی آیات کو بیان کیا ہے۔ یہ مضمون حقیقت میں اقبال شناسی کا عمدہ شاہکار ہے۔

''معارف اقبال'' نومنتخب مضامین کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۷۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں مختصر مضمون ''اقبال کے دینی عقائد'' اور طویل مقالہ ''اقبال اور عشق رسول ﷺ'' بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تمام مضامین مختلف اوقات میں لکھے۔ اشاعتی حوالے سے ان مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں۔

ا۔	اقبال کا تاریخی اور سیاسی پس منظر	ماہ نامہ: احسن رام پور	نومبر ۱۹۴۹ء
۲۔	اقبال اور برگساں	رسالہ ساقی: کراچی	جنوری ۱۹۵۱ء
۳۔	ترجمان خودی	تحریر و تقریر	۱۹۶۲ء
۴۔	اقبال کا نظریۂ شعر و ادب	(رسالہ بیّنات: کراچی)	۱۹۶۳ء
۵۔	اقبال اور تصوف	(اقبال ریویو، شمارہ ۲)	۱۹۷۶ء
۶۔	اقبال اور عشق رسول ﷺ	(نقوش اقبال نمبر)	۱۹۷۷ء

دوسرے حصے میں ایسے تین مضامین شامل ہیں۔ جو پہلے شائع ہو چکے تھے لیکن مناسب تبدیلی کے ساتھ ''معارف اقبال'' میں شامل کر دیے گئے۔

ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا مجموعہ ''تحقیقی جائزے'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اسی میں ایک مضمون ''اردو شعرا کے دینی عقائد'' کے عنوان سے شامل ہے۔ ان کا مضمون ''اقبال کے دینی عقائد'' اسی سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح ایک مضمون ''اقبال اور برگساں'' ہے۔ یہ مضمون تحقیقی جائزے (مطبوعہ: ۱۹۶۸ء) میں شامل ہے۔ اس میں ایک مقالہ ''ترک اور اردو شعرا'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون سے دیگر شعرا کا ذکر ختم کر کے صرف برگساں کو رہنے دیا گیا ہے۔ باقی مضمون وہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی کتاب "Meta physics of Creative Evalution" کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ یہ دونوں فلسفی ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مضمون میں مشرق و مغرب کا نظریاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس جائزہ میں مغرب کے دیگر فلسفیوں کے نظریات (حقیقت کائنات اور حقیقت زندگی) پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد

برگساں پر ان فلسفیوں کے اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اسی ترتیب کے ساتھ مشرقی فلسفیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال پر ان کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔آخر میں اقبال اور برگساں کا نظریاتی جائزہ موجود ہے۔ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون سے مشرق اور مغرب کے یکساں اور مختلف نظریات واضح ہوکر سامنے آتے ہیں۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ''اقبال اور قرآن'' شائع ہوئی۔اس کتاب میں انھوں نے اقبال کے اشعار کے حوالے سے احادیث کو بہ طور تلمیحات استعمال کیے جانے کی طرف اشارہ کیا اور اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ کتاب کی ضخامت کے باعث احادیث نہیں دی جارہیں۔ان کے مضمون ''اقبال اور حدیث'' کے اشارے اسی سے ملتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۷ء سے ۱۹۷۸ء تک مسلسل فکر اقبال کے مطالعہ میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔''اقبال اور حدیث'' ایک ایسا مضمون ہے، جو ان کی علم حدیث میں مہارت پر دلالت کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں اقبال کی دو مثنویوں اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی سے ایسے اشعار دیے ہیں، جن اشعار پر حدیث کے اثرات تھے۔مثال کے طور پر اقبال کا شعر ہے:

امتیازات نسب را پاک سوخت
آتش اُو ایں خس و خاشاک

حجتہ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ:''پس نہ کسی عربی کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے ہاں بزرگی کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے ایسے اشعار بھی اس مضمون میں دیے ہیں، جن میں من وعن حدیث کے الفاظ موجود ہیں۔دلائل کے ساتھ ایسے اشعار بھی فراہم کیے ہیں، جن میں احادیث کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے مفہوم استعمال کیا گیا ہے۔

'' کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر'' اہم مضمون ہے۔اس مضمون کو پڑھتے

ہوئے ڈاکٹر صاحب کے وسعت مطالعہ اور قوت مشاہدہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ مقالہ تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ ابتدا سے ۱۹۱۱ء تک ۲۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۳ء تک

۳۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک

یہ تقسیم باقی اقبال شناسوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ یہ تقسیم ان کی منفرد فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ مصنف نے سنین کے اعتبار سے سیاسی واقعات کے متعلق تلمیحات کو بیان کیا ہے۔ اس مضمون سے پہلے ۴۱۔۱۹۴۰ء میں ایک مضمون ''اقبال اور سیاست'' لکھا۔ درمیان میں دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ ڈاکٹر صاحب اس دوران اقبال کو مسلسل پڑھتے رہے۔ ''کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر'' اس مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

''اقبال کا نظریہ شعر وادب'' میں اقبال کے شعر وادب کے حوالے سے نظریات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح انھوں نے اسلامی حقائق اور قومی نظریے کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

اقبال کا پسندیدہ موضوع عشق رسول ﷺ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کلام اقبال کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان کے اردو اور فارسی کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا، جو عشق رسول ﷺ کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مضمون ''اقبال اور عشق رسولؐ'' میں اسرار خودی اور موز بے خودی کے اشعار کو بہ طور حوالہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ خطوط اقبال سے بھی استفادہ نظر آتا ہے اور ایسے خطوط سے اقتباس دیے گئے ہیں، جن میں اقبال نے اپنے اشعار کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ اس مضمون میں تسلسل اور ترتیب اس طرح سے ہے کہ پہلے نعتیہ کلام پھر مسلمانوں سے خطاب اور آخر میں دعائیہ اشعار دیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کلام اقبال کو عشق رسول ﷺ کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے، جو نہایت اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مضمون ''اقبال اور ترک'' مختلف حیثیات کا حامل ہے۔ اس میں ان کی نظر بیک وقت علم لسانیات، علم تاریخ، ادبی پس منظر اور اقبال شناسی پر ہے۔ اس مضمون میں اردو پر ترکی کے اثرات، برصغیر پاک وہند کے ترک بادشاہوں کی تاریخ اور ان کے اثرات کے علاوہ اردو کے ابتدائی زمانہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہ مضمون مختصر، متوازن اور جامع ہے۔ اس میں

انھوں نے ترکی کے اردو میں مستعمل الفاظ پر بحث کی ہے اور کلام اقبال پر ترکی اثرات کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون ان کے طویل مقالے ''ترک اور اردو شعرا'' سے ماخوذ ہے۔ان کا یہ مضمون لسانیات اور تاریخ پر دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وہ خود بھی صوفیانہ سلسلے سے منسلک تھے اس لیے صوفیانہ عقائد و نظریات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کا مضمون ''اقبال اور تصوف'' اقبال کے صوفیانہ عقائد پر مبنی ہے۔انھوں نے اس مضمون میں اقبال کو حضرت مجدد الف ثانی کے صوفیانہ عقائد و نظریات کے قریب قرار دیتے ہوئے اقبال کو وحدۃ الوجود نظریے کے خلاف کہا ہے۔

ان کا ایک اور مضمون ''ترجمان خودی'' کے عنوان سے ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اس میں اقبال کی فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' کے منظوم ترجمہ پر تبصرہ کیا ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن اور عبدالرشید نے ''اسرار خودی'' کا منظوم ترجمہ کیا۔انھوں نے ان دونوں تراجم کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ڈاکٹر صاحب کے یہ مضامین ان کی وسعت مطالعہ اور قرآن فہمی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

> ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی علمیت میں ایک متوازن لب لہجہ اور معنی و مغز سے باثروت انداز و اسلوب کا احساس ہوتا ہے اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے نقد و تنقید کے مروجہ انداز و رجحانات کی تعلیم کے بجائے اپنی بات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ حقائق و حکمت اور معارف و بصائر کا پہلو زیادہ اجاگر ہو گیا ہے۔(۲۱)

اقبال پر ان کا آخری مضمون ماہنامہ ''آہنگ'' (۱۹۸۳ء) میں ''اقبال اپنے خطوط کے آئینے میں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۷۷ء کا سال علامہ اقبال کا سال قرار دیا گیا اور اس کے زمرے میں ملک بھر سے اقبال شناسوں کو اقبال پر کتابیں تحریر کرنے کا کام تفویض ہوا۔

ڈاکٹر صاحب چوں کہ اقبال شناسی اور قرآن فہمی میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اس لیے انھیں ''اقبال اور قرآن'' کا موضوع دیا گیا۔انھوں نے وقت مقرر پر اس کام کو پورا کیا اور دیباچے میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعام کی وجہ سے قرآن سے متعلق انھیں یہ کام عنایت ہوا، جو انھوں نے بحمد اللہ چند ماہ میں مکمل کر لیا۔اس کا مسودہ ۲۹ نومبر ۱۹۷۶ء میں مکمل ہوا اور اپریل ۱۹۷۸ء کو یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب نہایت شہرت کی حامل ہیں۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں اور چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آیا اس کے صفحات کی تعداد ۱۱۱۸ ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلے ''اقبال اور قرآن'' کے حوالے سے کئی تحریریں سامنے آ چکی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی تالیف میں خطبات اقبال اور خطوط اقبال کے علاوہ دوسرے مصنفین کی کتب سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی رائے کو ملحوظ خاطر رکھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کی تکمیل میں ''مقالات اقبال'' پر گہری نظر رکھی اور کلام اقبال کو کھنگال کر رکھ دیا۔انھوں نے فکر اقبال کے تمام گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ان کا یہ کام انھیں عالم دین محقق اور مفسرِ قرآن ثابت کرتا ہے۔انھوں نے آیات کریمہ کا ترجمہ کیا ہے۔اگرچہ دوسروں کے تراجم سے بھی استفادہ نظر آتا ہے لیکن زیادہ تر تراجم انھوں نے خود ہی کیے ہیں۔

یہ دو ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے عنوانات قرآن پاک ہی سے لیے گئے ہیں۔باب اول ''تبصرۃ وذکری'' میں ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے قرآن کے حوالے سے خیالات ونظریات اور واقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ''رموز بے خودی'' سے نعتیہ اشعار بھی دیے ہیں۔ڈاکٹر صاحب اقبال کے ان اشعار کو بہ طور حوالہ پیش کرتے ہے، جس میں وہ اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اگر وہ قرآن کے علاوہ کچھ اور کہیں تو انھیں ختم کر دیا جائے اور قوم کو ان کے شر سے محفوظ رکھا جائے نیز قیامت میں انھیں رسوا اور آپ ﷺ کے دیدار سے محروم کر دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس باب میں وہ تمام حوالے جمع کر دیے ہیں، جو اقبال کی قرآن سے گہری دلی وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے باب دوم ''لکل عبد منیب'' کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ کلام اقبال کو موضوع کے مطابق رکھا ہے اور ''اسرار خودی'' کے تناظر میں قرآنی تلمیحات اور آیات وضاحت

کے ساتھ لکھی ہیں ۔ایسے حوالہ جات قرآنی مضامین کے حوالے سے فراہم کیے ہیں ،جن کا ذکر اقبال نے خودنہیں کیا۔ یہ کتاب جہاں اقبال کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتی ہے وہاں ان کے نور بصیرت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ڈاکٹر صاحب قرآن کے حافظ ہوں۔ بعض ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ایک شعر کے ذیل میں ایک سے زیادہ قرآنی آیات کو بہ طور حوالہ پیش کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق (ناگ پور: بھارت)

> ''اقبال اور قرآن'' پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا ایسا نادر علمی اور ادبی کارنامہ ہے جو نہ صرف شاعر کی شخصیت کو اس کی نئی عظمت کے ساتھ جلوہ گر کرتا ہے بلکہ اس کے مصنف کی شخصیت بھی اس طور پر اپنی انفرادی علمی اور ادبی بلندیوں پر نظر آتی ہے۔''(۲۲)

ڈاکٹر صاحب کو اس معرکۃ آرا کتاب پر ''اقبال ایوارڈ'' (مع پچیس ہزار روپے) ۱۹۸۳ء میں دیا گیا۔ بعد ازاں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۸۱ء تک اقبالیات میں شائع ہونے والی کتب میں اسے سندِ فضیلت دی گئی۔ ۱۹۸۵ء میں اسی کتاب کو صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔

(و) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت مقدمہ نگار

مقدمہ یا دیباچہ سے کتاب کا آغاز کیا جاتا ہے۔مقدمہ خود بھی لکھ سکتے ہیں اور کسی سے لکھوایا بھی جا سکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیفات و تالیفات کے مقدمات اردو، عربی اور فارسی میں لکھے ہیں۔اس کے علاوہ انگریزی کتابوں کے مقدمے بھی اردو میں تحریر کیے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے مقدمات کی خصوصیات میں اختصار، سادگی، منکسرانہ مزاجی، قرآنی اثرات، اپنے معاونین کے لیے دعائیہ انداز اور فارسی کا اثر ہے۔

تالیفات کے مقدمات طویل ہیں۔ یہ تالیفات زیادہ تر سلسلہ نقش بندیہ کے بزرگوں اور نادر رسائل، مکتوبات وغیرہ سے متعلق ہیں۔اس لیے ڈاکٹر صاحب نے کتاب کی ضرورت کے پیش نظر مصنف کے حالات و واقعات اور تعلیمات کو مقدمے میں تفصیلاً پیش نہیں کیا۔ان مقدمات کی اہم خوبیاں سادگی، مذہبی رجحانات، تحقیق و جستجو، کتاب یا مخطوطے کی قدامت، مآخذ و مصادر کی

نشاندہی، مطبوعہ نسخوں سے تقابل، تحقیق نتائج، مشاہیر بزرگان، نقش بندیہ کی معاشرتی اہمیت اور حواشی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تیسری قسم کے مقدمات مختلف شاعروں، ادیبوں اور عالموں کی کتابوں کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھے ہیں۔شعری تصنیفات کے حوالے سے مقدمات دو حصوں میں منقسم ہیں۔مثال کے طور پر تحقیقی کتب میں اگر محقق کی تحقیقی کاوش اور معیار تحقیق کوملحوظ خاطر رکھتے تو اسلامی کتابوں میں مصنف کا مطالعہ، کتاب کے مشمولات اور اسلوب پر گفتگو کرتے۔

اصلاحی کتب کے مقدمات میں معاشرتی برائیوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کا مقام ومرتبہ متعین کرتے اور کتاب کی افادیت کو زیر بحث لاتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے شعری تصنیفات کے حوالے سے مقدمات منظّم ہیں۔شاعر کی وفات کے بعد لکھے گئے مقدمات میں اس کے تحقیقی ذوق،سوانح اور ذاتی حالات کوموضوع بحث بناتے ہیں۔

زندہ شاعروں کی کتابوں کے مقدمات میں توازن اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کا عنصر غالب ہے اگر اصلاحی شاعری ہوتی تو مقدمہ نسبتاً طویل تحریر کرتے تھے۔بقول مرزا طارق حسین:

> ''یہ مقدمات ادبی روح کے ساتھ ساتھ اسلامی روح سے بھی ہم آہنگ ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے وہ مقدمات جو کہ آپ کی شخصیت، علمی خدمات وعلمی زندگی پر محیط ہیں اور جہاں ان کی ایک واضح اہمیت یہ ہے کہ وہ قبلہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، الحمدللہ کی تسبیح کرتا ہے۔''(۲۳)

ڈاکٹر صاحب کے مقدمات خاص اہمیت کے حامل ہیں،اس لیے کہ انھوں نے باقاعدہ اسے بھی ایک علم کا درجہ دیا ہے۔جہاں ان مقدمات میں تصنیف کا مطالعہ نظر آتا ہے۔وہاں ڈاکٹر صاحب مصنف کے

رجحانات ومیلانات کی وضاحت بھی کر دیتے ہیں۔اس لیے ان کے مقدموں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

(ز) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت خطوط نگار

اہل علم کے مکتوبات یا خطوط علم کا خزانہ ہوتے ہیں اور اپنے اندر کئی دینی، علمی اور ادبی مسائل کے حل کا ذریعہ بنتے ہیں۔بعض اوقات کسی مسئلے پر بڑی سے بڑی کتاب پر ایک خط یا مکتوب فضیلت رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ہی سے مکتوبات محققین کے لیے توجہ کا مرکز رہے کیوں کہ مکتوبات کسی بھی عہد کے سیاسی وسماجی حالات کا آئینہ دار بھی ہوتے ہیں اور شخصیت کے بھی۔اگر چہ خطوط ذاتی نوعیت ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت سماجی بن جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بزرگان دینؒ خاص طور پر سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگان کے مکتوبات کو مرتب کرنے اور نادر مکتوبات کو تلاش کر کے شائع کرانے کا سلسلہ جاری کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے خطوط کی علمی وادبی اہمیت مسلمہ ہے۔علمی ودینی معاملات میں ان کے خطوط دینی مسائل، تصوف کے مراحل، روحانی کیفیات اور ذکر واذکار کی وضاحت کرتے ہیں جب کہ ادبی موضوعات میں، تحقیقی مقالات کے عنوانات، تلفظ، املا کے مسائل جیسے موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں۔بعض خطوط میں خوابوں کی تعبیر، قرآنی تفسیر اور اخلاقی اقدار کی تشریح اور اس کے ساتھ کتابوں کے حوالے، کتب خانوں کے پتے اور رسائل کے اشاریے موجود ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے خطوط کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ظرافت اور سنجیدگی کا مجموعہ ہے۔بقول مشفق خواجہ

> ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنے خطوں میں تو خردنوازی کی انتہا کر دی ہے۔ وہ مکتوب الیہ کو عزیز گرامی منزلت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور کام نہ کرنے پر تنبیہ بڑی محبت سے اور اس طرح کرتے ہیں: کب تک خاموش رہو گے، کس کی نظر بد لگ گئی ہے مجھے تم سے کیا کیا توقعات ہیں۔''(۲۴)

ڈاکٹر صاحب کے خطوط پر بزرگوں کے خطوط کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ بزرگوں کے لیے القابات جب کہ شاگردوں سے شفقت کا انداز ملتا ہے۔

خطوط کے آخری حصے پر ان کے مرشد حضرت زوار حسین شاہؒ صاحب کا اثر ہے۔ خط کے آخر میں عموماً فقط لکھا کرتے لیکن ۱۹۴۹ء کے بعد ''احقر'' لکھنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے مکتوبات میں دینی و دنیاوی تعلیمات بھی ملتی ہیں۔ ان کے خطوط کی نوعیت تعزیتی بھی ہے اور طبی نسخوں کے حوالے سے بھی اہم ہیں۔ بہر حال اپنے علمی و ادبی نکات کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے خطوط کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

(ح) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں بہ حیثیت تاریخ گو

تاریخ گوئی با قاعدہ ایک فن ہے، جس کے ذریعے، واقعات و سانحات کو عالمانہ اور شاعرانہ انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تحریریں ادب کا حصہ بننے کی وجہ سے برقرار رہتی ہیں۔ ان میں واقعات کے اعداد کو بہ حساب جمل جوڑا جاتا ہے اور اس سے سال اخذ کر لیا جاتا ہے۔ یہ تاریخیں نثر اور نظم دونوں میں نکالی جاتی ہیں۔ نظم میں زیادہ مشکل ہے کیوں کہ یہ منظوم ہوتی ہیں۔ اس لیے ان میں بحر اور وزن کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ شعر میں وہی تاریخ گوئی کر سکتا ہے جو زبان و بیان اور بحور و وزن میں کامل دست گاہ رکھتا ہو۔

ایک زمانے تک شادی بیاہ، وفات، کتابوں کی اشاعت پر تاریخی نام رکھنے کا رواج رہا اور عام طور پر اسے ہی اساتذہ فن میں شمار کیا جاتا، جو تاریخ گوئی میں بھی مہارت رکھتا۔ ڈاکٹر صاحب نے بیدل کے مکتوبات و کلیات کا تاریخی تعین کیا اور ان کی تاریخ گوئی پر مضمون لکھا۔ اس کا عنوان ''کلام بیدل کا تاریخی تعین'' ہے، جو ان کی تصنیف ''چند فارسی شعرا'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو شاعر کہنے سے گریز کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کے تاریخی قطعات منظوم ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ فنِ عروض میں بھی مہارت رکھتے تھے اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ایک جامع کمالات شاعر تھے۔ انھوں نے تاریخی قطعات بھی لکھے اور کئی تاریخیں نظم کیں۔

ڈاکٹر صاحب کی تاریخ گوئی کی ابتدا کا کھوج لگایا جائے تو انھوں نے سب سے پہلی تاریخ اپنے والد (گلاب خاں) کی فارسی میں کہی۔انھوں نے ضیا احمد بدایونی سے بی اے میں فارسی پڑھی۔ چوں کہ ان (ڈاکٹر صاحب) کے استاد محترم ضیا احمد بدایونی تاریخ گو شاعر بھی تھے۔انہی کی صحبت نے ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی فارسی کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی میں پیدا کردی۔ابتدائی طور پر انھوں نے ضیا احمد بدایونی ہی سے شاہ نامہ کے تاریخی ناموں کا تذکرہ کیا۔ یہاں سے باقاعدہ ان کی تاریخ گوئی کا آغاز ہوتا ہے۔تاریخ گوئی کے حوالے سے ان کا نام بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتابوں کے نام بھی تاریخی رکھے اور بعض دوسرے مصنفین کی فرمائش پر ان کی کتابوں کے بھی تاریخی نام تجویز کیے۔تاریخ گوئی کے حوالے سے ان کے تاریخی قطعات پر مشتمل مجموعے ''وقائع تاریخ'' اور ''نفائس تاریخ'' شائع ہو چکے ہیں۔

انھوں نے مشاہیر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور ان سے سہواً یا عمداً جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان کی تصحیح کردی۔ڈاکٹر صاحب کے تاریخی قطعات اردو، عربی اور فارسی میں موجود ہیں۔ان کا قرآن کے حوالے سے مطالعہ گہرا تھا۔اس لیے انھوں نے آیاتِ قرآنی سے بھی تاریخیں حاصل کی ہیں۔ان کے زیادہ تر تاریخی قطعات وفات پر ہیں۔''وقائع تاریخ'' میں ۱۴۱ تاریخیں جمع ہیں۔ جب کہ ''نفائس تاریخ'' میں ۶۵ تاریخیں ہیں۔بقول مسرور احمد زئی:

> ''قطعات میں کہیں الجھاؤ، پیچیدگی نہیں ہے بلکہ رواں اور برجستہ تاریخیں ہیں۔''(۲۵)

ان کا اسلوب سادہ ہے اور کہیں ابہام نہیں ہے۔اس لیے ڈاکٹر صاحب ایک منفرد تاریخ گو کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔

(ط) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی خدمات (سلسلہ نقش بندیہ کے حوالے سے)

ڈاکٹر صاحب نے اکتوبر ۱۹۴۹ء میں سلسلہ نقش بندیہ کے بزرگ زوار حسین شاہؒ صاحب

سے بیعت کی۔اسی کے ساتھ ان کی دلچسپی مسائلِ تصوف میں پیدا ہوئی اور انھوں نے بزرگوں کے حالاتِ زندگی اور علمی کارناموں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ڈاکٹر صاحب نے بے شمار نادر اور نایاب کتابوں کو مرتب کر کے شائع کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ڈاکٹر صاحب نے، جن بزرگوں کی کتابیں مرتب کر کے شائع کرائیں، ان کے متعلق تحقیق وجستجو کے بعد ایسی معلومات فراہم کیں، جو کہیں اور نہیں ملتی۔ان کی کتاب ''سندھ کے نقش بندی اولیاؒ'' اسی سلسلے کی ایک نمایاں اور عمدہ مثال ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی علمی خدمات کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔انھوں نے بزرگوں کی کتب، مکتوبات اور رسائل کو مرتب کرنے کے علاوہ ان کے تراجم اور حواشی تحریر کیے۔جو کام نقشبندیہ سلسلے کی ترویج واشاعت کے لیے کام کرنے والے ادارے نہ کر سکے وہ ڈاکٹر صاحب نے تنہا انجام دیا اور مسلسل تصنیف وتالیف میں مصروف عمل رہے۔ڈاکٹر صاحب کی سلسلہ نقش بندیہ کے حوالے سے علمی خدمات کا آغاز ۱۹۵۶ء سے ہوتا ہے۔شاہ ابوسعید کی کتاب **''ہدایت الطالبین''**۔اس کے بعد درج ذیل کتابیں اس حوالے سے منظرِ عام پر آئیں۔

۱۔ **''رسائل مشاہیر نقشبندیہ''(۱۹۵۸)**

یہ چار بزرگان نقشبندیہ کے رسائل کا مجموعہ ہے جس میں ''رسالۂ شریفہ'' از خواجہ عزیز ان میتنی ''رسالۂ قدسیہ'' از خواجہ بہاء الدین نقشبندی ''رسالۂ انسیہ'' مولانا یعقوب چرخی اور **''رسالہ انفاسِ نفسیہ''** از خواجہ عبیداللہ احرار شامل ہیں۔

۲۔ **ملفوظات اکابر نقش بندیہ(۱۹۵۹)**

اس میں خواجہ محمد پارسا، مولانا شمس الدین روجی، مولانا سعد الدین کاشغری، مولانا علاء الدین اور مولانا عبیداللہ احرار کے ملفوظات شامل ہیں۔

۳۔ **ارشادِ رحیمیہ موسومہ بہ رحمت رحیمیہ(۱۹۵۹ء)**

شاولی اللہ محدث دہلوی کے والد شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی کی تصنیف جس کا ترجمہ سید ظہیرالدین نے کیا۔ڈاکٹر صاحب نے اس ترجمے کو جدید اور آسان اردو میں منتقل کر کے شائع کیا۔

اس کے علاوہ آ گاہی سید امیر کلام (۱۹۶۱ء)، انتخاب مکتوبات امام ربانی قدس سرہ (۱۹۶۱) ، اثبات النبوۃ (۱۹۶۳)، تحفۂ زواریہ (۱۹۶۳)، وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول علیہ (۱۹۶۳)، عارف نامہ (۱۹۶۳)، سعید البیان (۱۹۶۵)، رد روافض (۱۹۶۵) مکاشفاتِ عینیہ (۱۹۶۵)، رسالہ تہلیلیہ (۱۹۶۵)، حضرت مجدد الف ثانی، ایک تحقیقی جائزہ (۱۹۶۵)، مجمع البحرین (۱۹۶۵)، تحقیق الحق المبین (۱۹۶۶)، مکتوبات خواجہ عبدالاحد سرہندیؒ موسومہ گلشن وحدت (۱۹۶۶)، مکتوبات خواجہ سیف الدین (۱۹۶۶) موسوم بہ مکتوبات سیفیہ، وصال احمدی (۱۹۶۸) رسالہ سلوک ومشائخ طرقِ اربعہ (۱۹۶۹)، مکتوبات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی (۱۹۷۲)، لوائح خانقاہِ مظہریہ، موسوم بہ مکتوبات مدرسہ دیر (۱۹۷۵)، مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی (۱۹۷۶)، سندھ کے نقشبندی اولیاءؒ (۱۹۷۶)، سبیل الرشاد (۱۹۷۷)، حضرات القدس (۱۹۸۳)، زبدۃ المقامات (۱۹۸۶)، باقیات باقی (۱۹۹۰)، دیوانِ میرزا مظہر جانِ جاناں مع خریطۂ جواہر (۱۹۸۸) ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا دائرہ بہت وسعت کا حامل ہے۔اس کے علاوہ بھی سلسلہ نقش بندیہ کے سلسلے میں ان کے تصنیفی وتالیفی کام ہیں، جس میں انھوں نے بزرگان نقش بندیہ کی شخصیات اور تعلیمات کو موضوع بنایا ہے۔ان میں حضرت ہاشم کشمیؒ، عبدالحق محدث دہلویؒ، مظہر جاں جاناں اور غلام نبی نقشبندی شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''فضل کبیر'' (۱۹۹۹) میں شائع ہوئی۔ یہ ان کے روحانی واقعات پر مشتمل تصنیف ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور انھوں نے صوفیانہ تعلیم دیتے ہوئے تزکیہ نفس کو تصوف کی بنیاد قرار دیا اور سلسلہ نقش بندیہ کے بزرگوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔اگرچہ خود کو انھوں نے پوشیدہ رکھا۔

(ی) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خدمات اُردو نصاب کی تدوین کے حوالے سے

ڈاکٹر صاحب ۱۹۳۷ء میں کنگ ایڈورڈ کالج (امراؤتی) میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ یہاں اردو کا کوئی بھی استاذ نہیں تھا۔ وہ صدر شعبہ اردو مقرر ہو گئے۔ڈاکٹر صاحب نے نصاب میں تبدیلی کی کیوں کہ یہاں اردو میں مرزا انیس ودبیر کے مراثی شامل تھے۔انھوں نے نصاب میں

تبدیلی کرتے ہوئے قدیم غزلیں بھی شامل کر دیں تا کہ نصاب متوازن رہے۔

اس کے بعد ''ناگ پور یونی ورسٹی'' میں صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے یہاں پر ''اقبالیات'' کا شعبہ شروع کیا نیز یونی ورسٹی کے نصاب میں قدیم شعرائے اردو کو بھی شامل کیا۔ اس کے علاوہ طلبا کی آسانی کے لیے یونی ورسٹی کے سالانہ میگزین میں میر، درد، اقبال اور عزیز لکھنوی پر سوانحی مضامین لکھے۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان آئے تو اس کے کچھ عرصہ بعد اسلامیہ کالج میں صدر شعبہ کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ انھوں نے اسلامیہ کالج (شعبہ اردو) کا نصاب مرتب کرتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ طلبہ کی کردار سازی بھی ہو۔ اس لیے نصاب کا انتخاب مذہبی اور مسلم تہذیب کے حوالے سے کیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں اردو سائنس کالج کے قیام کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب صدر شعبہ بنائے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں مولوی عبدالحق کے مشورے سے نصاب مرتب کیا۔ نصاب میں تنقید، تحقیق، شاعری، ادب، فارسی، مثنویات اور مرثیے شامل کیے گئے۔ ابھی تک یہی نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد آئے اور یہاں صدر شعبہ سندھ یونی ورسٹی مقرر ہوئے۔ یہاں پر بھی انھوں نے نصاب میں تحقیق، مذہب اور اقبال کو خاص جگہ دی تحقیق میں خاص طور پر عربی اور فارسی کو لازمی قرار دیا۔ عربی صرف ونحو کو پڑھنے کے لیے ''قرآنی عربی'' کے نام سے کتابچہ تحریر کیا اور اسے شامل نصاب کر دیا۔ اُردو املا کے لیے بھی کام کیا۔ اردو نثر کے مضمون میں دو کتابیں ''حالی کا ذہنی ارتقا'' اور ''علمی نقوش'' رکھی گئی۔ فکشن میں فسانۂ آزاد رکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی نصاب میں دل چسپی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جو نصاب مقرر کیا یا جس کی سفارش کی اس کے لیے مضامین بھی لکھے اور طلبا کی راہ نمائی کے لیے لکھوائے بھی۔ حسرت کی ''نکاتِ سخن'' نصاب میں شامل کی تو اسے لاہور سے شائع کرایا۔ اس میں اغلاط تھیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے طالب علموں کی ''فن عروض'' میں مہارت ضروری تھی۔ طلبا کی اس ضرورت کے پیش نظر ایک مضمون ''اردو عروض'' لکھا۔

ڈاکٹر صاحب نے ایم اے اور بی اے کا نصاب بھی مرتب کیا اور بچوں کے نصاب کی تدوین میں بھی بھر پور کردار ادا کیا۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، شعبہ اردو کے مرتبین میں شامل رہے اور وہاں ان کی رائے کو ہمیشہ مقدم سمجھا جاتا۔ انھوں نے نصاب میں اسلامیات، اخلاقیات اور پاکستانیات کو برقرار رکھا اور اس کے لیے کام کیا۔

(ک) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور فارسی زبان وادب

فارسی زبان ایک عرصے تک برصغیر پاک وہند کی سرکاری اور ادبی زبان رہی۔ ڈاکٹر صاحب کو فارسی سے خاص لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخ گوئی کا آغاز فارسی قطعات سے کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے زمانہ طالب علمی میں فارسی میں پہلا مضمون لکھا جو اب محفوظ نہیں۔ انھوں نے فارسی زبان وادب کا مطالعہ کیا اور فارسی زبان کے مزاج اور ارتقا پر لکھتے رہے۔ اگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کا ایک بڑا حصہ فارسی شعرا پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے فارسی کے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن پر اہل ایران کی نظر بھی نہیں پڑی تھی۔ اہل ایران نے ان کی بہت تعریف کی اور ان کے چند مقالات کو انسائیکلو پیڈیا آف تہران میں بھی جگہ دی۔ اس کے علاوہ ان کی فارسی زبان وادب کے حوالے سے کتاب ''فارسی پر اردو کا اثر'' ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئی۔ معین الدین عقیل کے مطابق:

> ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اردو کی انگریزی کے ساتھ اثر اندازی کا بھی ایک مطالعہ کیا ہے۔ ان کا مقالہ ''فارسی پر اردو کا اثر'' اپنے موضوع پر ایک بہت جامع اور معلوماتی وتحقیقی کارنامہ ہے۔(۲۶)

اس کے علاوہ بھی فارسی زبان وادب پر کتابیں لکھیں۔ ان میں چند فارسی شعراء (۱۹۸۹) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں شعرا کے سیاسی، تاریخی اور ذاتی حالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ''فارسی ادب ہندو پاک میں'' (انگریزی) اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک عمدہ تحقیقی کاوش ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خطوط پر بھی فارسی اثرات نمایاں ہیں۔ انھوں نے بعض کتابوں

کے دیباچے فارسی میں لکھے۔ یہ زیادہ تر وہ کتابیں ہیں، جو سلسلہ نقش بندیہ کے بزرگوں کی ہیں۔

(ل) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی دیگر کتابوں کا جائزہ

ڈاکٹر صاحب کی دیگر کئی تحریریں، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ان میں علمی نقوش (۱۹۵۷ء)، ۱۵ تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے اس کے آخر میں مصنف کے نام مشاہیر کے منتخب خطوط دیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ڈاکٹر صاحب کے چھے طویل تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ان مضامین میں حالی کی فارسی شاعری، حالی کا ذہنی ارتقا، حالی کی اردو غزل اور سرسید اور مقدمۂ شعر وشاعری وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں دوسرا۱۹۶۶ میں اور تیسرا ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے حالی کا ذہنی ارتقا کے نام سے ایک عالمانہ مقالہ رسالہ اردو میں لکھا۔ اس میں حالی کے سارے ادبی کام کی توقیت کی یعنی سن تالیف متعین کیا ہے۔ حالی کی جملہ تصانیف کی فہرست بھی اس میں دستیاب ہے۔(۲۷)

ڈاکٹر صاحب کے ذاتی حالات پر مشتمل کتاب'' تاریخ اسلاف'' ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں ان کے بچپن، تعلیم ، یادیں، مطالعہ، سفر اور خاندانی بزرگوں کے کاموں وغیرہ کا ذکر شامل ہے۔ جامع القواعد (حصہ نحو:۱۹۷۳)، سرگزشت کابل (۱۹۸۰ء) اور اس کے علاوہ بھی دیگر کئی تصنیفات ہیں۔

(م) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی قرآن شناسی

ڈاکٹر صاحب نے قرآن پاک سے ہر مرحلے پہ کسب فیض کیا۔ان کی تعلیم وتربیت ہی ایسے دینی گھرانے میں ہوئی، جس نے ان کی فکر کو اسلامی حوالے سے مہمیز کیا۔ بچپن میں انھوں نے قرآن پاک پڑھا اور والدین کا سنا بھی۔ بقول ڈاکٹر صاحب:

''میں والد صاحب کا استاد بن گیا، اس طرح پورے قرآن میں انھوں نے میری غلطیوں کی اصلاح فرمادی، پھر والدہ صاحبہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور میرا ناظرہ صحیح کرادیا۔''(۲۸)

ان کی والدہ محترمہ بھی انھیں قرآن خوانی کا درس دیتی رہیں۔لہٰذا ان کی زندگی کے معمولات میں قرآن شامل ہوگیا۔ڈاکٹر صاحب نے تنقید وتحقیق جیسے موضوعات میں قرآن سے بھرپور استفادہ کیا خاص طور پر'' پیام اقبال'' اور''اقبال اور سیاست'' میں قرآنی حوالے فراہم کیے۔ان کی تحریروں اور تقریروں پر قرآنی تلمیحات کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قرآن پاک سے متعلق مکمل مضامین بھی ہیں،جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔	قرآن وحدیث کے بدائع وصنائع	ہمارا علم وادب	۱۹۸۵ء
۲۔	قرآن پاک اور صوتیات	ندائے سحر	۱۹۹۵ء
۳۔	اصحاب رسول ﷺ کا ذکر قرآن پاک میں	ایضاً	
۴۔	رسول کریم ﷺ قرآن حکیم کی نظر میں		
۵۔	قرآنی تراجم وتفاسیر	ایضاً	
۶۔	ہمہ قرآن در شان محمد ﷺ	نقوش، جلد اول	۱۹۸۲ء
۷۔	علم تفسیر	اوراقِ گم گشتہ	۱۹۹۷ء

ڈاکٹر صاحب نے وحی منظوم پر دیباچہ لکھا، جو قرآن پاک کے تراجم وتفاسیر کی تاریخ کا درجہ رکھتا ہے۔اس کے علاوہ قرآن کے حوالے سے کتب میں ضیاء القرأت ۱۹۵۶ء،قرآنی عربی ۱۹۶۶ء، اردو میں قرآن وحدیث کے محاورات، مطالب القرآن ۱۹۸۲ء، ہمہ قرآن در شان محمد ﷺ ۱۹۸۳ء، ندائے سحر ۱۹۹۵ء۔انھوں نے اپنی چند کتابوں کے نام قرآن پاک سے اخذ کیے ہیں، جیسے ابواب مستفرقہ، لنا اعمالنا، انعمت علیھم، طوبیٰ لھم، باقیات، سراجِ منیر، فضلِ کبیر وغیرہ۔

حوالہ جات

۱۔ نذیر احمد، ڈاکٹر، تاریخی تحقیق کے بعض بنیادی مسائل، مشمولہ: تحقیق وتدوین (جلد اول) علی گڑھ: ۱۹۸۷ء، ص ۷۰۔

۲۔ گیان چند، تحقیق کا فن، ص ۴۱۔

۳۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر، نصائح مصطفوی، ص ۲۰۔

۴۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی وادبی خدمات، ص ۲۰۷۔

۵۔ قاضی عبدالقادر، ڈاکٹر، تصنیف وتحقیق کے اصول، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۔

۶۔ عبدالماجد دریابادی، صدق جدید، حیدرآباد: ۱۹۵۷ء، ص ن۔

۷۔ روزنامہ جنگ (جمعہ ایڈیشن)، کراچی، ۳۱ مئی ۱۹۹۶ء۔

۸۔ غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، تحقیقی جائزے، شعبہ مطبوعات بزم غالب، سکھر: ۱۹۶۸ء، ص ۱۸۔

۹۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی وادبی خدمات، ص ۲۱۸۔

۱۰۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی وادبی خدمات، ص ۲۲۵۔

۱۱۔ مشفق خواجہ، ہمارے استاد پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، حرفِ چند، انوارِ ادب: ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۔

۱۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقا، انجمن ترقی اُردو: ۱۹۶۱ء ص ۱۱۔

۱۳۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: حالات، علمی وادبی خدمات، ص ۳۵۲۔

۱۴۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: حالات، علمی وادبی خدمات، ص ۳۶۰۔

۱۵۔ فرمان فتح پوری، مجلّہ تحقیق، شمارہ: ۴ جامع سندھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۶۴۔

۱۶۔ عشرت رحمانی، اردو ادب کے آٹھ سال، مشمولہ مضمون: اردو ادب میں دخیل الفاظ، از مولوی عبدالحق، س ن، ص ۵۴۔

۱۷۔ وفا راشدی، ڈاکٹر، اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ، اردو اکیڈمی، لاہور: ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۶۔

باب سوم

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی اُردو کے لیے خدمات

(ایک جائزہ)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اردو کی ترویج و ترقی کے حوالے سے بے شمار خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب ماہر لسانیات تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں مہارت کاملہ رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی تحقیقات کا دائرہ وسعت کا حامل ہے۔

اردو بنیادی طور پر ایک لچک دار زبان ہے، جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ اپنے اندر جذب کرنے کی گنجائش زیادہ ہے کیوں کہ کوئی بھی زبان اپنے گرد و پیش کی زبانوں سے الگ تھلگ رہ کر پھل پھول نہیں سکتی۔ اُردو کا دوسری زبانوں سے رابطہ بہت مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے اور اب وہ اردو ہی کا حصہ نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان پر ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے نگاہ ڈالی اور دیگر کامل زبانوں پر اردو کے اثرات تلاش کیے، جس سے اردو کی اہمیت بڑھ گئی صرف یہی نہیں کہ اردو نے عربی، فارسی اور انگریزی کے اثرات قبول کیے بلکہ ان زبانوں نے بھی اردو کا اثر قبول کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا نمایاں اور قابل ذکر کام ''فارسی پر اردو کا اثر'' ہے، جس میں ایسے بہت سے الفاظ دیے گئے ہیں، جو اردو کی وساطت سے فارسی میں داخل ہو گئے۔ اگر چہ ان کی شکل تبدیل ہو گئی لیکن ان کی اصل اردو ہی ہے۔ کیوں کہ زبان ماحول اور حالات سے اثر قبول کرتے ہوئے شکل تبدیل کرتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی خدمات کے سلسلہ میں ایک اہم کارنامہ ان کا تحقیقی مضمون ''اُردو املا کی تاریخ'' ہے۔ اس میں قدیم اردو کے نمونے پیش

کیے گئے ہیں۔حرف پرتنقید علاقائی حروف کی اشکال کی مدد سے کی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونی ورسٹی سے منسلک ہونے کے ساتھ ہی اردو زبان پر توجہ مرکوز کی۔خاص طور پر مقامی زبانوں کے اردو کے ساتھ روابط پر تحقیق کی۔اسی پس منظر میں ''اُردو سندھی لسانی روابط'' کے موضوع پر اپنے ایک شاگرد سے پی ایچ ڈی بھی کرائی۔لسانیات ان کی دل چسپی کا خاص میدان تھا،ڈاکٹر وفا راشدی کے مطابق:

> ''ڈاکٹر صاحب ماہر تعلیم اور اردو،انگریزی ادبیات ولسانیات کے بھی ماہر ہیں۔عربی، فارسی،اردو انگریزی ادبیات میں کامل ہیں۔ یہ مقام، یہ کمال وسیع وعمیق مطالعہ،ان تھک محنت،شب وروز کی لگن اور خداداد ذہانت وصلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔''(۱)

ان کے خاص موضوعات لسانی روابط، زبانوں کے صوتی نظام اور لسانی مسائل ہیں۔اگر''اردواملا کی تاریخ'' کا جائزہ لیا جائے تو قدیم مخطوطات ومطبوعات کے سلسلے میں ان کے وسعت مطالعہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں حرف پر علاقوں کے حوالے سے بحث کی ہے، جو ان کی محنت وریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بقول ڈاکٹر مسرور احمد زئی:

> ''املا حروف کے صحیح استعمال کا عمل ہے......حرف کو موضوع بناتے ہوئے اردو نظم ونثر میں اس کے نمونے پیش کیے ہیں اور ان نمونوں پر علاقائی زبانوں کے اثرات واضح کیے ہیں۔ایک ہی حرف، ایک ہی زمانے میں مگر مختلف علاقوں میں کس طرح لکھا گیا۔''(۲)

ڈاکٹر صاحب نے خان آرزو اور ان شاء اللہ خاں انشا کی تصریحات کے متعلق معلومات فراہم کیں۔''اردواملا کی تاریخ''میں غالب اور احسن کے علاوہ ان جملہ تحقیقات کا ذکر کیا گیا ہے، جو اس موضوع کے سلسلے میں ہوتی رہی تھیں۔ڈاکٹر صاحب کی اُردو زبان کی خدمات کے سلسلے میں ایک اہم کارنامہ قدیم شاعروں اور ادیبوں کے مخطوطات ومطبوعات کی لسانی خصوصیات کا احاطہ کرنا ہے۔انھوں نے املائی اصولوں کو نکات کی صورت میں پیش کیا ہے۔نیز الفاظ کے حوالے سے مختلف ادوار سے مثالیں پیش کیں ہیں۔

ہندی اور سنسکرت کی طرح اردو کو بھی آریائی زبان قرار دیا۔ کیوں کہ ان سب میں مشترکہ چار اصول موجود ہیں۔ انھوں نے اردو قواعد کی بنیاد بھاشا اور ہندی کو قرار دیا۔ آریائی زبانوں کے الفاظ سامی زبانوں سے چھ گنا زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو میں عربی فارسی کے علاوہ ترکی الفاظ کی نشان دہی بھی کی ہے۔ مثال کے طور پر : اچی (بڑا بھائی)، باجی (بڑی بہن)، جادر (خیمہ) وغیرہ۔ تجوید کے مشترکہ اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں پر اس انداز سے بحث کی گئی ہے کہ ان میں تبدیلی کی وجوہات، قواعد اور عوامل کا جائزہ بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک زبان کے ہم معنی اور ہم صوتی الفاظ دیے گئے ہیں، جن میں یہ اصول وضوابط موجود ہیں اور ان کی وضاحت فارسی مصادر سے دی گئی ہے۔ نیز ایسے فارسی مضارع کی مثالیں فراہم کی گئی ہیں، جو ایک ہی زبان کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی آواز تبدیل کر لیتے ہیں۔

لفظ پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کیسے وہ اپنے خاندان یا قریبی عہد کی زبان میں رائج ہوتا ہے لیکن جیسے ہی ماحول تبدیل ہوتا ہے زبان کی صوت میں تبدیلی آجاتی ہے اور اردو کی خدمات کے سلسلے میں یہ قابل قدر تحقیقی کام ہے۔ کسی خطے کا مجموعی ماحول، تہذیب وثقافت اور دیگر زبانیں ایک زبان کو متاثر کرتی ہیں۔ اس لیے ماہر لسانیات کا متعلقہ زبان کے ماحول، تہذیب وثقافت اور دیگر زبانوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، انگریزی پراکرت (جدید ہندی) اور سنسکرت پر مکمل عبور تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اردو کی جغرافیائی حدود سے بھی آگاہ تھے کیوں کہ جغرافیائی اور معاشرتی حالات کسی بھی علاقے کی زبان پر منظّم اثرات مرتب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو پر تحقیق کرتے ہوئے سہل راستے کا انتخاب نہیں کیا۔ ان کے جملے مختصر اور زبان سادہ ہے۔ دیگر ماہر لسانیات کے برعکس طویل اقتباسات سے اجتناب کرتے تھے۔ انھوں نے اردو میں ادغام کا قاعدہ، املے کا اصول اور اس سے الفاظ میں

تبدیلی اور تلفظ میں فرق کے اصولوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ ایسی خوبی ہے، جو دوسرے ماہر لسانیات کے ہاں نہیں نظر آتی۔

ان کا موضوع زبان کی لسانی خصوصیات تک محدود نہیں بلکہ اس میں ایک ہی زبان کے تبدیل شدہ اور ہم معنی الفاظ سے بھی بحث موجود ہے، نیز زبان کیسے تبدیل ہوتی ہے؟ ڈاکٹر صاحب اس کی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر ان عوامل تک پہنچ جاتے ہیں، جو تبدیلی کی وجہ بنتے ہیں۔ انھوں نے غلط العام اور غلط العوام پر بحث کی ہے۔

اگر چہ اردو کے حوالے سے ان کا نظریہ پہلے سے موجود نظریات سے الگ نہیں ہے کہ اردو میں حروف مختلف زبانوں سے آئے ہیں اور اردو میں (دیگر زبانوں سے) زیادہ حروف موجود ہیں۔ اس لیے کہ اردو زبان جملہ زبانوں سے آئے ہوئے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتی ہے۔ زبان کے معاملے میں تعصب یا تنگ نظری اسے نقصان پہنچاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے اعتراضات پر بھی بحث کی ہے اور عربی سے استفادہ کرنے کی کوشش پر زور دیا ہے۔ اردو کی خدمات کے سلسلے میں ان کی قابل ذکر کاوش لغت نویسی ہے۔ کیوں کہ جب تک زبان پھلتی پھولتی رہتی ہے اس میں لغت نویسی کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی لغت نویسی ان کی شبانہ روز محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں ان کا اولین با قاعدہ اور باضابطہ کام ''سندھی اردو لغت'' (۱۹۵۴۔۱۹۵۳ء) ہے۔

وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کی طرف سے سندھ یونی ورسٹی کو اس کام کی مد میں فنڈز کی پیش کش کی گئی اور یہ طے پایا کہ اردو اور سندھی بولنے والوں کی آسانی کے لیے دو لغات ''سندھی اردو لغت'' اور ''اُردو سندھی لغت'' مرتب کرائی جائیں گی۔

ڈاکٹر صاحب کو ان لغات کے اردو حصہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انھوں نے انتہائی جاں فشانی سے یہ کام مکمل کیا۔ وقت اور سرمایہ کے محدود ہونے کے باوجود یہ لغت اپنی مثال آپ ہے اور اعلیٰ جماعتوں کے طالب علموں کی ضروریات کو بہ خوبی پورا کرتی ہے۔ اس کی ہجائی ترتیب سندھی ادبی بورڈ کی ''سندھی لغت'' کی طرز پر ہے۔ الفاظ کی صوتیات اور تشریحات کو سمجھنے کے لیے اردو مترادفات کے ساتھ ایک ہجائی نقشہ ضمیمہ میں موجود ہے۔

سندھی کے ساتھ ایسے الفاظ ہیں جن کا بدل ممکن نہیں ان کو ویسے ہی رہنے دیا گیا ہے مثال کے طور پر:

پ، چ، ج، ژ، ک، گ، ٹ ہر لفظ کی شناخت اور اس سلسلے کو ایک خاص ترتیب سے دیا گیا ہے مثلاً:

۱۔ ایسے حروف جو اپنی اصلی شکل میں ہیں، ان کے آگے نشان الحاق (=) دیا گیا ہے۔

۲۔ الفاظ اور ان کے مشتقات کو سندھی رسم الخط میں حرکات کے ساتھ ایسے لکھا گیا ہے کہ پہلے واحد اور پھر جمع اور جمع کی وضاحت نشان جمع (ج) سے کی گئی ہے۔

یہ لغت بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کی ان تھک محنت نظر آتی ہے کیوں کہ وہ ایک ایک لفظ کی اصل تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح ''اردو سندھی لغت'' کے حوالے سے خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو الفاظ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے صورت خطی قائم کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ لغت ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی اس میں کل ۱۹۶۶۰الفاظ ہیں۔

وزارت تعلیمات حکومت پاکستان نے ۱۹۵۸ء میں انگریزی کی کلاں آکسفورڈ ڈکشنری (نیو انگلش ڈکشنری) کی طرز پر لغت شائع کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس لغت کے متعلق ڈاکٹر مسرور احمد زئی لکھتے ہیں کہ:

> ''ابتدا میں جو خاکہ بنایا گیا اس میں لغت میں تمام الفاظ کی صوری ومعنوی تبدیلیوں کا تاریخی جائزہ لینا، قدیم یا متروک لفظ کی آخری مروجہ شکل کو معیار قرار دے کر بنیادی لفظ کے طور پر داخل لغت کرنا۔ لفظ کا تلفظ علامت کے علاوہ اعراب ملفوظی کے ذریعے ظاہر کرنا، قواعدی حیثیت واضح کرنا، معنی کی جامع تشریح کرنا اور ان تمام نکات کو اسناد وماخذ سے بیان کرنا شامل تھا۔''(۳)

اس لغت کے مدیر اعلیٰ مولوی عبدالحق تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح

پوری، ڈاکٹر حنیف فوق، سحر انصاری، ڈاکٹر یونس حسنی اور رؤف پاریکھ نے بورڈ کے مدیر اعلیٰ کے فرائض انجام دیے۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں (عربی، فارسی، انگریزی، ہندی) کے پس منظر پر موثر بحث کرتے۔ غرض انھوں نے غلط الفاظ کی تصحیح، اردو کے تلفظ، قواعد اور بنیاد پر کام کیا۔ بقول رؤف پاریکھ:

''ڈاکٹر صاحب زبان کے استعمال میں حد درجے احتیاط برتتے ہیں نہ صرف یہ کہ الفاظ وتراکیب کے استعمال میں ان کا نقطۂ نظر بھی ان کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو ڈاکٹر صاحب کی تحریر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے (مثلاً وہ لوگ جنھیں ڈاکٹر صاحب خط لکھتے ہیں) وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب املا کے اصولوں اور اس ضمن میں اپنے نظریات پر کس قدر احتیاط سے عمل کرتے ہیں۔''(۴)

ڈاکٹر صاحب نے مختلف نوعیت کے کام کیے لیکن اردو کی خدمت کو کبھی پس پشت نہ ڈالا بلکہ جہاں تک ہوسکا اردو کی بقا اور ترقی کام کے لیے سرگرم عمل رہے۔ اگرچہ وہ ماہر لسانیات بھی ہیں، لغت شناس بھی اور ماہر اقبالیات بھی۔ تاریخ گوئی بھی ان کا خاص میدان ہے۔ غرض علم وادب کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس سے ڈاکٹر صاحب وابستہ نظر نہ آتے ہوں لیکن ان سب میں واضح مقصد اردو زبان کی ترویج وترقی ہے اور اس کی آبرو میں اضافہ کرنا ہے۔ اسی لیے مسرور احمد زئی کے خیال میں:

''ڈاکٹر صاحب نے مختلف انداز کے کام انجام دیے ہیں اور ہر میدان میں خلوص نیت اور اردو خدمت، اردو ترقی کا جذبہ ....آپ کے اولین مقاصد رہے ہیں۔''(۵)

ڈاکٹر صاحب نے اردو صرف ونحو پر کتاب لکھی، جس کا عنوان ''اردو صرف ونحو'' ہے۔ اس میں اُردو نحو کے قواعد اور اصولوں کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ انھوں نے ایسے الفاظ کی تفصیل فراہم کی ہے جن کا املا غلط رائج ہو چکا ہے۔ ایک باب ''املا اور علاماتِ وقف'' کے متعلق ہے، جس میں غلط اور درست املا کے فرق کے ساتھ معنی بھی دیے ہیں۔

انھوں نے اس کے علاوہ ''ہمارا تلفظ'' (۱۹۹۹ء) کے عنوان سے ایک مختصر کتابچہ تحریر کیا۔ حقیقت میں یہ صحیح اردو رائج کرنے کی مخلصانہ کاوش ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ''ہمارا تلفظ'' میں ایسے الفاظ کے صحیح معنی دیے گئے ہیں، جو بالکل سامنے کے ہیں لیکن ان کا تلفظ غلط ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب، اردو املا کی تاریخ، جامع القواعد اور ''ثقافتی اردو'' تحریر کر چکے تھے۔ انھوں نے شعوری طور پر کوشش کی کہ صحیح اردو بولی جائے اور صحت کے ساتھ لکھی جائے۔ ڈاکٹر صاحب کی اردو نصاب کی تدوین کے سلسلے میں خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تقرری بہ حیثیت لیکچرر اردو کنگ ایڈورڈ کالج (امراوَتی) میں ہوئی۔ یہاں اردو کا کوئی استاد نہیں تھا۔ لہٰذا صدر شعبہ مقرر ہو گئے۔ کالج کے نصاب میں مرزا انیس و دبیر کے مراثی زیادہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے قدیم غزلیات کو بھی شامل نصاب کر دیا اور یوں نصاب متوازن ہو گیا۔

یعنی ڈاکٹر صاحب پاکستان آنے سے پہلے بھی اردو میں دل چسپی لے رہے تھے لیکن جب جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے تو یہاں بھی اسلامیہ کالج میں صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ انھوں نے صدر شعبہ منتخب ہوتے ہی اردو نصاب کو از سر نو ترتیب دیا اور ایسا نصاب مرتب کیا، جس سے طلبا و طالبات کی اخلاقی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔ اس نصاب میں مذہبی رجحانات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و فکر کی ترجمانی موجود تھی۔

۱۹۵۰ء میں اُردو سائنس کالج کراچی کے قائم ہونے کے ساتھ ہی یہاں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ یہاں بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مدد اور مشورے سے اردو نصاب ترتیب دیا اور تحقیق، تنقید، شاعری، فکشن، مثنویات، مراثی، اقبالیات اور فارسی کے مضامین شامل کیے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۶ء میں سندھ یونیورسٹی (حیدر آباد) سے منسلک ہوئے یہاں بھی اردو نصاب کا از سر نو جائزہ لے کر مرتب کیا۔ خاص طور پر نصاب میں مذہب، تحقیق اور اقبالیات کو جگہ دی گئی۔ انھوں نے تحقیق کے موضوع پر اپنی نوعیت کا پہلا مضمون لکھا اور تحقیق میں عربی اور فارسی کو ضروری قرار دیا۔

عربی صرف و نحو کو سمجھنے کے لیے ''قرآنی عربی'' کے عنوان سے کتابچہ تحریر کیا۔ اس میں انھوں نے عربی قواعد اور مصادر سمجھائے۔ اردو املا کا پرچہ بھی شامل نصاب کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے ''منتخبات'' کے عنوان سے ایک کتاب تحریر کی، جس میں طویل مضمون ''اُردواملا کی تاریخ'' بھی شامل کیا گیا۔ڈاکٹر صاحب نے صحیح اردو لکھنے کا قاعدہ بتایا اور اردواملا کی صحت پر خاص توجہ دی ہے۔

اردوعروض پر ایک مضمون ''اُردوعروض'' کے عنوان سے تحریر کیا۔ اگر چہ یہ مختصر سا مضمون ہے لیکن اس میں اُردو شاعری کی مروجہ بحور اور اوزان بھی بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے تمام نکات کو پیش کیا۔ڈاکٹر صاحب جہاں ضرورت محسوس کرتے طلبہ کے لیے خود بھی کتابیں تحریر کرتے اور کراتے بھی۔ انھوں نے خاص طور پر نصاب میں نعتیہ ادب کو شامل کرتے ہوئے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ان کی حتی الامکان یہ کوشش ہوتی کہ اس کی طباعت معیاری اور اغلاط سے پاک ہو۔ وہ اردو کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ طلبہ تک معیاری کتابیں پہنچیں اور اس مقصد کے لیے کتابوں کی قیمتیں بھی کم رکھی جاتیں تا کہ ہر طالب علم اس سے استفادہ کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے نصاب کو مرتب کیا بلکہ بچوں کا نصاب بھی ترتیب دیا۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کا نصاب بھی مرتب کرنے والوں میں شامل رہے۔ ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کی رائے کو معتبر سمجھا جاتا۔ وہ تمام عمر آسان اردو پڑھنے اور لکھنے پر زور دیتے رہے ان کا ایک مضمون ''نظریہ پاکستان'' کے عنوان سے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل ہے، جو پاکستان کی اساس پر ہے۔ یہ مضمون عہد اکبر سے شروع ہوتا ہے اور مجدد الف ثانی کی تحریک سے ہوتا ہوا تمام اہم تاریخی واقعات کو بیان کرتے کرتے قیام پاکستان تک پہنچتا ہے۔ اس مضمون کی جامعیت، اختصار اور افادیت کے پیش نظر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ نے بھی اسے شامل نصاب کرنے کا فیصلہ کیا۔

بحیثیت مجموعی اگر نصاب کا جائزہ لیا جائے تو انھوں نے اردو نصاب سے فرقہ وارانہ تعصّبات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور نصاب میں پاکستانیت اور اخلاقیات کو پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار اردو کے عظیم محققین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تمام عمر اردو کے ساتھ گزار دی۔ اردو کو بہ طور مشغلہ نہیں اپنایا بلکہ حرزِ جاں بنایا اور تمام عمر اردو ان کی رفیق کار کی حیثیت سے رہی۔

انھیں اردو کے بہ حیثیت قومی زبان ہونے کا احساس اور شعور تھا اور یہ بھی کہ زندہ زبان، زندہ قوموں کی پہچان ہوتی ہے کیوں کہ زبان کسی بھی ملک کے باشندوں کی شناخت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ زبان اور قوم ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ دونوں مل کر ترقی کی منازل طے کرتے ہیں اور ایک ملک کے دانش وروں اور صاحب شعور لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ رکھیں اور محفوظ ہاتھوں میں دے کر جائیں تا کہ ان کا دنیا میں وقار برقرار رہ سکے۔

ڈاکٹر صاحب کا شمار صاحب بصیرت، صاحب ادراک اور صاحب شعور محققین میں ہوتا ہے، جنھیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس تھا۔ صرف احساس ہی نہ تھا بلکہ انھوں نے تمام عمر اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں گزار دی۔ ڈاکٹر صاحب اردو کے بنیاد دوں گزاروں کی صف سے کسی بھی صورت پیچھے نظر نہیں آتے۔ اگر ان سے آگے نہیں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی کاوش اور محنت سے اردو کا دامن وسیع کیا۔ ایک عام طالب کو صحیح اردو لکھنے اور پڑھنے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے مختصر مضامین اور کتابچے تحریر کیے۔ کیوں کہ نوجوان طبقہ ہی مستقبل کا معمار ہوتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے شعوری طور پر ایسے طبقے کو صحیح املا کی طرف متوجہ کیا۔

اُردو نصاب میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترویج کو مقصد بنایا اور مذہب کے تابع نصاب مرتب کیا، ایسے بزرگوں کا تحقیقی کام شامل نصاب کیا جو نادر ونایاب سرمایہ چھوڑ گئے۔ لفظ شناسی کی طرف متوجہ ہوئے تو کثیر تعداد میں الفاظ کو محفوظ کر دیا اور ان کے اصل معانی بھی دے دیے۔

غرض ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایک ایسے محقق ہیں جن کی زندگی اردو کے ساتھ نظر آتی ہے، جب بھی اردو زبان کے حوالے سے بات ہوگی ان کے ذکر کے بغیر اردو زبان کی تاریخ ادھوری رہے گی۔

حوالہ جات

۱۔ وفا راشدی ، ڈاکٹر، ''اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ'' اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۴،ص۱۰۶۔

۲۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی وادبی خدمات''، ص۳۹۴۔

۳۔ ایضاً، ص۴۱۴

۴۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، ''عصری ادبی اور سماجی رجحانات'' اکادمی بازیافت نو، ۲۰۰۳ء، ص ۵۷/۵۸۔

۵۔ مسرور احمد زئی، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی وادبی خدمات''، ایضاً ص، ۵۵۰۔

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیاد گزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیشِ نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیاد گزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔ اس منصوبے کے تحت مختلف شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے وقیع کتابیں مرحلہ وار شائع ہوتی رہیں گی۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اردو کے عہد ساز استاد، محقق، تنقید نگار اور مدیر ہیں۔ ان کی شناخت کی متعدد جہتیں ہیں مگر سب جہتوں میں مشترک پہلو اُردو ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی درجنوں تحقیقی اور تنقیدی کتابیں اردو ادب کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہیں۔ آپ ایک طویل مدت اردو زبان و ادب کی درس و تدریس کا کام کرتے رہے اور سیکڑوں شاگرد اردو کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

زینت افشاں اردو ادب کی باصلاحیت سکالر ہیں۔ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے سلسلۂ مطبوعات مشاہیرِ اُردو کے لیے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے احوال و آثار کو محیط یہ مختصر مگر جامع کتاب لکھ کر اردو زبان و ادب کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔